سونیا نوید

تجدیدِ وفا

عرشی نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے تیزی کے ساتھ سامنے والی بلڈنگ کی طرف قدم بڑھائے۔ ساتھ ہی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا جو کہ ایک قطعی غیر ضروری عمل تھا۔ گھڑی دیکھے بنا ہی اسے پتا تھا کہ اسے دیر ہو چکی ہے۔ عرشی نے سن گلاسز آنکھوں پر سے ہٹا کر سر کے اوپر ٹکا لیے اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ایک ہجوم تھا جو اس جگہ جمع تھا۔ سب اپنے شناسا چہروں کی تلاش میں کب سے یہاں آئے کھڑے تھے۔ یہ لاہور کے بین الاقوامی ایر پورٹ کا وہ بیرونی حصہ تھا، جہاں مختلف پروازوں سے آنے والے مسافروں کے استقبال کے لیے ان کے دوست اور رشتہ دار جمع ہوتے تھے۔

عرشی کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ لندن سے

ناولٹ

آنے والا جہاز نہ صرف لینڈ کرچکا ہے بلکہ جہاز سے اترنے والے مسافر بھی نکل کر جا چکے ہیں۔

سارا قصور عرشی کا اپنا تھا۔ یہ سوچ کر کہ بین الاقوامی پروازوں کے مسافر کون سا جلدی باہر آجاتے ہیں۔ وہ گھر سے ہی دیر سے نکلی تھی۔ شاید وہ پھر بھی وقت پہنچ جاتی اگر ایک سگنل پر پھرتیاں دکھاتے ہوئے بتی لال ہوجانے کے باوجود اس نے آگے نکل جانے کی کوشش نہ کی ہوتی اور نتیجے میں سائڈ سے آنے والی ایک سوزوکی سے نہ ٹکرا جاتی جس میں گھنی مونچھوں اور تنی بھنوؤں والے ایک کرنل صاحب بیٹھے تھے۔

بے شک۔ بروقت بریک لگالینے کے باعث دونوں گاڑیوں کا بے حد معمولی نقصان ہوا تھا۔ مگر چونکہ لڑکی نے سگنل توڑ کر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس لیے اس کی سزا بھی اسے لازمی ملنی چاہیے۔ یہ وہ موقف تھا جس سے اب کرنل صاحب صاحب ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

آخر بیس منٹ کی بک بک جھک جھک کے بعد' ایک عدد ٹریفک کانسٹیبل کی موجودگی میں یہ معاملہ رفع دفع ہوا پر تب تک اتنی دیر ہوچکی تھی کہ ایرپورٹ پر لندن سے آنے والا ایک بھی مسافر باقی نہیں بچا تھا۔

"ستیاناس ہو اس بڈھے کا۔" عرشی نے نہایت بگڑے موڈ کے ساتھ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کرنل کو کوسا جس کی وجہ سے اس کا ایرپورٹ کا چکر بے کار گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ اب اسے کسی مقررہ وقت پر کہیں نہیں پہنچنا تھا' عرشی نے گاڑی کی رفتار وہی رکھی جو ایرپورٹ جاتے وقت تھی۔

وہ شروع ہی سے ایسی تھی۔ جلد باز اور پارہ صفت جو چاہے بس فورا" مل جائے' لمحہ بھر کی بھی دیر نہ ہونے پائے۔

تھوڑی دیر بعد عرشی نے اپنی سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ بڑے سے آہنی گیٹ سے گزار کر چمکتے ماربل کے فرش والے پورچ میں لاکر کھڑی کی۔

لکڑی کا منقش داخلی دروازہ کھولا اور ایک کشادہ انٹرنس لابی میں داخل ہوگئی' جہاں سے گول چکر کھاتی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جارہی تھیں۔ عرشی کے دائیں طرف جھاڑن ہاتھ میں لیے گھر کا ایک ملازم لابی میں سجی چیزوں کی صفائی میں مصروف تھا۔

"نوردین! حذیفہ کہاں ہے؟" عرشی نے گردپونچھتے ملازم سے دریافت کیا' عرشی کا اس گھر میں اتنی باقاعدگی کے ساتھ آنا جانا تھا کہ نہ تو یہاں کے کسی ملازم کے لیے وہ اجنبی تھی' نہ ہی کوئی ملازم اس کے لیے انجان۔

"حذیفہ یہاں ہے جناب۔" نوردین کے کچھ بھی کہنے سے پہلے عرشی کو اپنے سوال کا جواب کہیں اور سے موصول ہوگیا۔

عرشی نے فورا" پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا' جہاں سے حذیفہ اتر کر نیچے آرہا تھا۔

"ہیلو کزن! کیسی ہو؟" وہ اپنی شرٹ کا کف بند کرتا ہوا اس کے قریب آکر بولا۔

"میں ٹھیک ہوں اور تم؟"

"دیکھ لو! تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" حذیفہ مسکرایا۔ اس کی پہنی ہوئی سفید شرٹ کہیں کہیں سے گیلی ہوکر جسم کے ساتھ چپک رہی تھی۔ سر کے بال بھی نم تھے۔ شاید وہ ابھی نہا کر نکلا تھا' جب ہی اتنا فریش لگ رہا تھا۔ نکھرے نکھرے سے حذیفہ کو اپنے سامنے دیکھ کر عرشی کو سارے دن کی کلفتوں کا اثر زائل ہوتا محسوس ہوا۔

"کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟" وہ ایک بازو کا کف بند کرلینے کے بعد اب دوسرے کے ساتھ زور آزمائی کررہا تھا۔

"ایرپورٹ سے؟" عرشی نے جواب دیا۔

"وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟" حذیفہ نے چونک کر پوچھا۔ توجہ آستین کے گرفت میں نہ آنے والے ڈھیٹ بٹن سے ہٹ کر عرشی کی طرف ہوگئی۔

"تمہیں لینے۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں ایرپورٹ پر نہیں دیکھا۔" وہ الجھ گیا۔

"مجھے پہنچنے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی' تم تب تک

وہاں سے جا چکے تھے۔" عرشی نے اسے بتایا۔

"پر تمہیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ڈرائیور آتو رہا تھا مجھے لینے۔"

"ایسے ہی' میرا دل کیا تمہیں سرپرائز دینے کو۔" عرشی نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا تو حذیفہ وہیں لابی کے بیچ کھڑا ہوکر اسے گھورنے لگا۔

"تم اور تمہارے سرپرائز' آخر تم کب سدھرو گی؟" عرشی کو گاڑی سیکھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ منع کرنے کے باوجود وہ کسی نہ کسی بہانے گاڑی لے کر اکیلی نکل جایا کرتی تھی۔

"اچھا بس' اب پلیز کوئی لیکچر مت دینا۔" عرشی نے اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑ کر اکتائے لہجے میں کہا۔

"اب کیا یہیں لابی میں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے یا اندر بھی چلو گے۔" وہ یہ کہہ کر ٹھک ٹھک کرتی اندر کی طرف چلی گئی تو حذیفہ کو بھی چاروناچار اس کے پیچھے جانا پڑا۔

ڈائننگ روم میں دانش علی ہمیشہ کی طرح اخبار پڑھنے اور ناشتا کرنے کا فریضہ بیک وقت انجام دے رہے تھے۔ ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھی اسمارہ چائے دانی سے چائے کپ میں انڈیل رہی تھیں۔

"ہیلو ایوری باڈی!" عرشی نے حذیفہ سے دو قدم آگے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ حذیفہ سے تو وہ لابی میں ہی مل چکی تھی۔ اب اس ایوری باڈی میں دانش اور اسمارہ ہی رہ جاتے تھے۔

"ہیلو بیٹا! کیسی ہو؟ آؤ بیٹھو ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔" اسمارہ نے آفر کی۔

"تھینک یو۔" عرشی نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے اسمارہ کی برابر والی کرسی کھینچ لی۔ حذیفہ بھی اس سے مقابل آکر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے درمیان رکھی لکڑی کی لمبی سی میز ناشتے کے لوازمات سے سجی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ' لندن میں کہاں کہاں گھومے؟" عرشی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میڈم! میں لندن گھومنے نہیں بلکہ ڈیڈ کے کام سے گیا تھا۔"

وہ مسکرایا۔ "لیجیے رعنا خالہ بھی آگئیں۔" گلاس میں جوس ڈالتے حذیفہ نے رعنا کو دروازے سے اندر آتا دیکھ کر کہا۔

"آج تو اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں ہم پر۔ پہلے عرشی' اب رعنا خالہ۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"چائے لیں گی آپا؟" اسمارہ نے چائے دانی کو ہلا کر اس میں موجود چائے کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہوئے رعنا سے پوچھا۔

"ہاں پلیز ایک کپ بنا ہی دو۔" رعنا نے اسمارہ سے کہا۔ پھر اپنا رخ عرشی کی طرف موڑتے ہوئے بولیں۔

"تم کب آئیں یہاں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"مجھے بتا دیتیں' ہم دونوں ساتھ ہی آجاتے۔ میں سمجھی اپنے کمرے میں سو رہی ہو گی۔" رعنا نے کہا۔

"تم اپنی ممی کو بغیر بتائے چلی آئیں؟ بہت بری بات ہے۔" حذیفہ نے جوس پیتی عرشی کو چھیڑا۔

"تو ممی کون سا مجھے بتا کر آئی ہیں۔ ان کے حساب سے تو میں کمرے میں پڑی سو رہی ہوں۔" عرشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"عرشی بیٹا! اس طرح بات نہیں کرتے۔" اسمارہ

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

کوئی ایسا اہل دل ہو

نبیلہ عزیز

قیمت --- -/250 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

نے عرشی کے لہجے کی ترشی اور اس کی وجہ سے رعنا کے چہرے کی معدوم ہوتی مسکراہٹ کو دیکھ کر اسے نرمی سے سمجھایا۔

"رہنے دو اسمارہ! اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ آج کل کے بچے بھی نا۔" رعنا' اسمارہ کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے تاسف سے بولیں۔

میز کے سرے سے اخبار کے کاغذ پھڑپھڑائے اور ان کاغذات کی اوٹ میں سے دانش کا چہرہ بر آمد ہوا۔ ابھی تک دانش نے ہر نئے آنے والے کو اخبار کا کونا ہٹا کر ایک خفیف سی استقبالیہ مسکراہٹ سے نوازنے کے علاوہ میز پر ہونے والی کسی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔

"ہاں بھئی' تمہارا آج کے دن کا کیا پروگرام ہے۔" دانش نے اخبار کو تہ لگا کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا جو اپنے لیے گلاس میں اور جوس ڈال رہا تھا۔

"آج کا کوئی خاص پروگرام نہیں' کیوں آپ کو کوئی کام تھا؟" حذیفہ نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں چاہ رہا تھا کہ تم دوپہر کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آفس کا چکر لگاؤ' صبح میری ایک میٹنگ ہے اور شام میں اسمارہ کی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے' اسے وہاں لے کر جانا ہے۔" دانش نے کہا تو حذیفہ نے تشویش سے ماں کی طرف دیکھا' جو ہتھیلی پر رنگ برنگی گولیاں رکھے انہیں نگلنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسمارہ کو گردوں کی بیماری تھی۔ لیکن ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کی تکلیف شروع میں ہی پکڑی گئی۔ ورنہ عام طور پر اس بیماری کی ابتدائی علامات اتنی معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں کہ جب تک لوگوں کو اس کا علم ہوتا ہے بیماری ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے۔

"ارے تم بھی کیا اس کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ پہلے دفتر کے کام سے باہر بھجوایا۔ اب وہ واپس آیا ہے تو آفس کے چکر لگوانے لگے ہو۔" رعنا بولے بنا نہ رہ سکیں۔ دانش سے عمر میں بڑی تھیں' اس لیے اکثر انہیں بلا جھجک ٹوک دیا کرتی تھیں' یہ الگ بات تھی کہ اپنے اسٹائل سے کٹے بال اور جدید تراش خراش کے ملبوسات کی بدولت وہ اپنی عمر کے پچپن برسوں سے کہیں کم دکھتی تھیں۔ دانش بھی جانتے تھے کہ وہ جو بھی کہتی تھیں۔ حذیفہ کی محبت میں کہتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حذیفہ اپنے ماں' باپ سے زیادہ رعنا خالہ کا چہیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے لاک کی اور لمز کی عمارت کی طرف قدم بڑھائے۔

حذیفہ کی کلاس شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ وہ ذرا پہلے آکر اپنے ایک ٹیچر سے اپنے پروجیکٹ کے بارے میں کچھ ڈسکشن کرنا چاہتا تھا۔ لمز کے جس حصے میں وہ تھا وہاں پروفیسرز کے آفس وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اس وقت حذیفہ کے علاوہ صرف ایک اور لڑکی اس لمبی سی راہ داری میں موجود تھی جو عمر اور حلیے سے اسٹوڈنٹ ہی لگ رہی تھی۔ وہ ہر دروازے پر لگی نیم پلیٹ کو پڑھتی ہوئی مخالف سمت سے حذیفہ کی طرف آرہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ہیل والی چپل اٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ آواز اتنی زیادہ نہیں تھی' مگر کوریڈور میں پھیلی خاموشی کی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

حذیفہ کا دھیان بے اختیار ہی اس لڑکی کے پیروں کی طرف چلا گیا۔ کالی پٹی والے سینڈل میں جکڑے' نیل پالش یا دوسری کسی بھی قسم کی آرائش سے عاری پاؤں' حذیفہ کو بہت صاف ستھرے لگے۔ حذیفہ نے آج تک کسی کے پیروں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ اس لڑکی کے پیروں کو دیکھ رہا تھا اور یہ ایک بالکل غیر ارادی حرکت تھی جس کا اسے خود بھی احساس نہیں تھا۔ پھر شاید یہ اس کی نظروں ہی کا کمال تھا کہ چلتے چلتے اچانک اس لڑکی کا پیر مڑا اور وہ بری طرح سے لڑکھڑائی۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر قریبی دیوار کا سہارا لیا تو سینے سے چمٹی کتابیں دھڑ دھڑ کرتی زمین پر جا گریں۔ ان میں سے

ایک کتاب کھسکتی ہوئی حذیفہ کے قدموں تک آگئی۔

لڑکی زمین پر جھکی ایک ہاتھ سے اپنی بکھری ہوئی باقی ماندہ کتابیں سمیٹ رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے نیچے ڈھلک آنے والے دوپٹے کو واپس کندھے پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب حذیفہ نے اپنے پاؤں کے پاس سے کتاب اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ۔" لڑکی نے کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تو حذیفہ نے دلچسپی سے اس کے خفت سے سرخ پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"سنیے! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر خاقانی کا کمرا کہاں ہے۔" حذیفہ نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا جب لڑکی نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈاکٹر خاقانی کا آفس اس فلور پر نہیں ہے۔ یہاں سے اتر کر نیچے چلی جائیے۔" حذیفہ نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "گراؤنڈ فلور پر اسی جگہ کے بالکل نیچے جو کوریڈور ہے اس میں الٹے ہاتھ پر تیسرا کمرا ان کا ہے' باہر ان کا نام بھی لکھا ہے۔" حذیفہ نے اس کی رہنمائی کی۔

جانے یہ اس گھبرایا ہوا شرمندہ سا چہرہ تھا یا پھر اس کا سادہ حلیہ' پر وہ حذیفہ کو یہاں ہر سال آنے والی لڑکیوں کی کھیپ سے ذرا مختلف لگی۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہو کر اسے ایک ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لیے اور دوسرے سے اپنی کتابیں سنبھالے سیڑھیوں سے سہج سہج اترتا دیکھتا رہا۔ ایک بار لڑکھڑا جانے کے بعد اب وہ بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی سی چوٹی اس کی کمر پر جھول رہی تھی۔ حذیفہ نے بہت کم کسی لڑکی کے اتنے لمبے اور گھنے بال دیکھے تھے۔

"پہلے پاؤں' اب بال' حد ہو گئی۔" "وہ کیوں خوامخواہ ایک ایسی لڑکی کو اتنی دیر سے گھور رہا تھا' جسے وہ جانتا ہی نہیں تھا۔" حذیفہ نے جھنجلا کر خود کو سرزنش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے جب گاڑی ذیلی سڑک سے نکال کر مین روڈ پر ڈالی تو اس وقت تارکول کی لمبی سڑک آسمان پر جا بجا بادلوں کی ٹولیوں کی وجہ سے دھوپ چھاؤں حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گاڑی کے بند شیشوں کی وجہ سے گو اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا' مگر گاڑی سے باہر گزرنے والے درختوں کی ایک طرف کو جھکی شاخوں اور پودوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ باہر اچھی خاصی ہوا بھی چلنے لگی ہے جو آسمان پر بکھرے بادلوں کو یہاں سے وہاں دھکیل کر زمین پر پھیلی دھوپ چھاؤں کو بار بار اپنی جگہ بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

حذیفہ سامنے کے منظر کو دیکھ کر قدرت کی فنکارانہ صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔ سڑک کے جن حصوں پر دھوپ تھی وہاں چمکیلا سنہرا پن تھا اور جہاں بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا وہاں نیلگوں اداسی پھیلی تھی۔ ایک ہی منظر میں دو متضاد کیفیات یکجا کر دینا صرف اس خالق کائنات ہی کی صلاحیتوں کا معمولی سا حصہ تھا۔

پھر سڑک کے اداس پس منظر والے حصے میں وہ حذیفہ کو دور ہی سے ایک بس اسٹاپ پر کھڑی نظر آگئی۔

اس کی سرخ رنگ کی قمیص کا دامن ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا' جسے وہ بار بار ہاتھ سے برابر کر کے گھٹنوں کے ساتھ لگانے کی کوشش کر رہی تھی' پر ہوا کی منہ زوری اس کی اس کوشش کو زیادہ دیر تک کامیاب نہیں رہنے دے رہی تھی۔

حذیفہ نے گاڑی اس لڑکی کے پاس لے جا کر روکی۔ حذیفہ کے اس طرح گاڑی روکنے پر نہ صرف وہ لڑکی چونکی بلکہ کچھ فاصلے پر کھڑے وہ دو لڑکے بھی چوکنے ہو گئے جو اکیلی لڑکی کو کمپنی دینے کی غرض سے وہاں موجود تھے۔ دھوپ نہ ہونے کے باوجود آنکھوں پر سستے قسم کے سن گلاسز چڑھائے' کلائیوں میں ربڑ بینڈ جیسے ڈھیروں دھاگے لپیٹے اور شرٹ کے کھلے گریبانوں میں سے نظر آنے والی میل سے کالی ہوتی چینیں لٹکائے ہوئے دونوں کس قماش کے لڑکے تھے۔ اس کا اندازہ حذیفہ کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے گاڑی ان دونوں لڑکوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر ہی روکی تھی۔ حذیفہ ان سڑک چھاپ لڑکوں کی

نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"آؤ! میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" حذیفہ نے بٹن دبا کر شیشہ نیچے کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"جی نہیں شکریہ، میں خود چلی جاؤں گی۔" لڑکی نے دھیمے، مگر قطعی لہجے میں انکار کیا۔ حذیفہ کو اس انکار کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہا۔

"تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں وہی ہوں جس سے تم نے ڈاکٹر خاقانی کے آفس کے بارے میں پوچھا تھا۔" حذیفہ نے یاد دلایا۔

"مجھے یاد ہے، لیکن آپ کو تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ بدستور روکھے لہجے میں بولی۔

حذیفہ نے ایک نظر پیچھے کھڑے ان دونوں لڑکوں پر ڈالی جو ہمہ تن گوش ہوئے ان کی گفتگو سن رہے تھے، پھر نرمی سے کہا۔

"بس یا ویگن کا کچھ پتا نہیں، کتنی دیر کے بعد یہاں سے گزرے۔ تم جہاں کہو گی میں وہاں چھوڑ دوں گا، مگر اس وقت....."

"آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ خوامخواہ ہی پیچھے پڑے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر جائیے یہاں سے۔" لڑکی حذیفہ کی بات کاٹتے ہوئے ترشی سے بولی۔

حذیفہ کا منہ سرخ ہو گیا۔ ایک ہی پل میں اس لڑکی نے اسے اور پیچھے کھڑے لڑکوں کو ایک ہی پلڑے میں ڈال کر تول دیا۔ ذرا سا بھی فرق محسوس نہیں ہوا اسے حذیفہ اور ان لفنگوں کی نیت میں جنہیں اکیلی لڑکی دیکھ کر اپنی قسمت آزمانے کا شوق چرایا تھا۔ حذیفہ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اتنی سبکی محسوس نہیں کی تھی، اس نے غصے کے عالم میں ایکسیلیٹر کو پیر سے دبایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

موسم کا سنہرا پن ایک دم سے غائب ہو گیا۔ کہیں کہیں بکھری چمکیلی دھوپ گہرے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپی۔ ونڈ اسکرین پر ٹپ ٹپ گرتے پانی کے قطروں نے بارش شروع ہونے کا اعلان کیا۔ حذیفہ نے گاڑی چلاتے ہوئے بیک ویو مرر میں دیکھا، وہ اب بس اسٹاپ پر نہیں کھڑی تھی، بلکہ تیز تیز قدموں سے سڑک کے کنارے چل رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے وہ دونوں لڑکے بھی۔

"بے وقوف لڑکی۔" حذیفہ نے گاڑی لال بتی پر کھڑی کرتے ہوئے بھنا کر سوچا۔

گاڑی کے سامنے والے شیشے پر سے وائپر مسلسل پانی صاف کر رہے تھے۔ مگر پچھلے شیشے سے اب کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ لڑکی، نہ ہی اس کا پیچھا کرتے لڑکے۔ حذیفہ کو بے چینی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں سگنل سبز ہو جانے والا تھا اور حذیفہ کو یہاں سے آگے نکل جانا تھا۔ بتی لال سے پیلی ہوئی اور پھر سبز۔ حذیفہ کی گاڑی آگے بڑھی پر سیدھا جانے کے بجائے یوٹرن لے کر تیزی کے ساتھ واپس پلٹی۔

وہ واپس کیوں مڑا تھا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ وہ اس ضدی، نا سمجھ لڑکی کو بارش میں ان پیچھا کرتے ہوئے لڑکوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

روڈ ون وے تھی۔ حذیفہ اب ساتھ والی سڑک پر مخالف سمت میں پیچھے کو جا رہا تھا۔ تیزی کے ساتھ پانی صاف کرتے وائپروں کے درمیان سے وہ لڑکی اب اسے دوبارہ دکھائی دینے لگی۔ اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ ان دونوں لڑکوں کو پیچھے چھوڑ سکے۔ وہ دونوں بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتے اب اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

کٹ پر پہنچ کر وہ پوری رفتار سے گاڑی کو موڑتا ہوا پہلی سڑک پر واپس لایا اور ان تینوں کے برابر لا کر اتنی زور سے بریک لگائے کہ سڑک پر ٹائروں کے نشان پڑ گئے۔ دونوں لڑکے حذیفہ کو دیکھ کر چھلانگ مار کے لڑکی سے پرے ہو گئے۔ لڑکی اب تک روہانسی ہو چکی تھی۔ حذیفہ کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر کر خود کو ہیرو سمجھنے والے ان لونڈوں کے منہ پر کس کر تھپڑ لگائے جو اکیلی

لڑکی کے سامنے شیر بنے ہوئے تھے اور اب اسے دیکھ کر دم دبا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"بیٹھو اندر۔" لڑکوں کے منہ لگنے کے بجائے اس نے تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لڑکی کو ڈپٹ کر کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ لڑکی گاڑی کے اندر تھی۔ اب وہ اتنی کوڑھ مغز بھی نہیں تھی کہ ایک بار کی غلطی کو دوبارہ دہراتی۔ اپنی حماقت کا اندازہ تو اسے اس وقت ہو گیا تھا جب حذیفہ نے اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ وہ دونوں لوفر لڑکے جو کافی دیر سے اس کے پیچھے کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے، اس کے انکار کو اپنی حوصلہ افزائی سمجھ کر قریب آگئے اور چھیڑ خانی کرنے لگے۔ ان کے بے ہودہ شعروں اور فقروں سے گھبرا کر اس نے چلنا شروع کر دیا، پر وہ دونوں کم بخت بھی واہیات ترین گانے گاتے اس کے پیچھے ہو لیے۔

لڑکی ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ اس کے گرد لپٹا دوپٹہ بارش سے بھیگ کر اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ حذیفہ نے ہاتھ بڑھا کر ہیٹر آن کر دیا۔

"میں مانتا ہوں کہ احتیاط اچھی چیز ہے، خاص طور پر لڑکیوں کے لیے، لیکن انسان میں اتنی صلاحیت تو ہونی چاہیے کہ وہ سامنے والے کی نیت اور خلوص کی گہرائی کو جانچ سکے۔" حذیفہ نے اپنی نظریں بھیگتی سڑک پر رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

حذیفہ نے لحظہ بھر کر سڑک سے نظر ہٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے شرمسار سی بیٹھی تھی، پھر خود ہی اپنی کہی بات پر متاسف ہو گیا۔ شاید ایک نوعمر لڑکی کے لیے لوگوں کے خلوص کو پرکھنا اور ان کی نیتوں کا اندازہ لگا لینا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

"بائی دا وے! میرا نام حذیفہ ہے۔" اپنی پہلی کہی بات میں رچی تلخی کے اثر کو کم کرنے کے لیے جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں آگئی تھی۔ حذیفہ نے اس بار لب لہجہ دوستانہ رکھا۔

"اور تمہارا نام؟"

"جویریہ۔" لڑکی نے اپنے گیلے دوپٹے کو ہیٹر کی گرم ہوا سے سکھانے کی کوشش کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"لمز میں یہ پہلا کوارٹر ہے تمہارا؟" حذیفہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں۔ ایم بی اے کر رہا ہوں۔" حذیفہ نے گاڑی موڑتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حذیفہ کے بارے میں یہ سب پہلے سے جانتی تھی۔

نیا یا پرانا۔ ایسا شاید ہی کوئی تھا جو حذیفہ دانش علی سے واقف نہیں تھا۔ آدھے سے زیادہ طلبا اس کے دوست تھے اور باقی اس سے دوستی کے خواہاں۔

گاڑی اب اچھی خاصی گرم ہو چکی تھی، اتنی کہ حذیفہ کو الجھن ہونے لگی، مگر اس نے ہیٹر بند نہیں کیا، کیونکہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی بھیگی ہوئی لڑکی کو اس کی گرمائش سے سکون مل رہا تھا۔

"تمہارا گھر کس طرف ہے؟" حذیفہ نے ایک ہاتھ سے گیئر بدلا۔

"جی؟"

"میرا مطلب ہے، تمہیں کہاں ڈراپ کروں۔" حذیفہ نے وضاحت کی۔

"مجھے... بس یہیں اتار دیجیے۔" اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب ایک خاصی مصروف سڑک پر آچکے تھے، جس پر اچھی خاصی تعداد میں بسیں اور ویگنیں آجا رہی تھیں۔

"یہاں اترنے کی ضرورت نہیں، تمہیں جہاں جانا ہے میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں! میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی۔" اس نے سہولت سے انکار کیا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

حذیفہ نے گاڑی سائیڈ پر لا کر کھڑی کی۔ لڑکی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور قریبی بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی، جہاں ایک بس مسافروں کو سوار کرنے کے

لیے رکی ہوئی تھی۔ گاڑی سے لے کر بس تک کا مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں اس کے ہیٹر سے سکھائے دوپٹے کو بارش کے قطرے ایک بار پھر بھگونے لگے۔

حذیفہ کو یاد آیا کہ جس دن وہ پہلی بار اس لڑکی سے ملا تھا' اس دن بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی' بس ایک عام سا اتفاق تھا' لیکن بعض باتیں عام سی ہونے کے باوجود بہت خاص لگنے لگتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس کا پورا نام جویریہ ندیم تھا اور وہ لمز کے نئے شروع کیے جانے والے ناپ پروگرام کے تحت ایڈمیشن لے کر یہاں پہنچی تھی۔ Nop یعنی
National out reach programme
ملک کے چھوٹے شہروں میں بسنے والے ان طلبا کو اعلا تعلیم کا موقع فراہم کرتا تھا جو ذہین ہونے کے باوجود مالی طور پر غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے لمز جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ جویریہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ وہ راہوالی کی رہنے والی تھی اور لاہور میں اس کی رہائش گرلز ہاسٹل میں تھی۔

اس دن کے بعد حذیفہ نے اسے یونیورسٹی میں کئی جگہ دیکھا' کبھی لائبریری میں نوٹس بناتے ہوئے' کبھی پیپر کپ میں بھری چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے یا پھر اپنا رنگ برنگے موتیوں اور سیپیوں سے سجا بیگ کندھے پر لٹکائے یوں ہی یہاں سے وہاں آتے جاتے ہوئے۔ ہمیشہ سر جھکائے' خاموش اور اکیلی' اس کا یہی اکیلا پن حذیفہ کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنا تھا۔

کلاسیں شروع ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اب تک نئے داخل ہونے والے لوگوں کی بھی ٹولیاں اور گروہ بن چکے تھے۔ ان لوگوں میں بھی دوستیاں ہو چکی تھیں جو پہلے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔ پر وہ ہنوز اکیلی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کی اپنی کلاس میں تقریباً" سب ہی کے ساتھ ہیلو ہائے تھی۔ اکھڑ مزاج بھی وہ نہ تھی۔ حذیفہ نے اسے جب بھی دیکھا' مہذب انداز میں ہی بات کرتے دیکھا۔ ذہانت' شائستگی' یہاں تک کہ ایک پرکشش شخصیت سب کچھ تو تھا اس کے پاس' پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اب تک ایک بھی دوست نہیں بنا پائی۔

رفتہ رفتہ حذیفہ کو احساس ہوا کہ جویریہ کے اس اکیلے پن کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ جب بھی کسی نے پڑھائی سے ہٹ کر کسی ایکٹوٹی میں اسے شامل کرنا چاہا یا اکٹھے مل کر اڑائی جانے والی کسی دعوت میں بلانا چاہا' اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ سوائے ٹیچرز کے دیے ہوئے ان پروجیکٹس پر جہاں اسے لازمی طور پر مل کر گروپ کے ساتھ کام کرنا پڑتا' وہ زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔

"ہوتے ہیں کچھ لوگ اس طرح کے بھی۔" حذیفہ نے سوچا۔ "اپنے آپ میں گم رہنے والے رزرووڈ سے۔"

وہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ اور اگر تھی تو حذیفہ کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ مگر اسے فرق پڑ رہا تھا۔ کیوں پڑ رہا تھا؟ یہ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے پہلے چاہے یہاں پر کسی نے گروہ بندی کی ہو یا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہو' حذیفہ نے کبھی دھیان دینے کی زحمت نہیں کی تھی تو پھر اب کیوں؟ کیا وجہ تھی کہ اس لڑکی کا اکیلا پن اسے اچنبھا لگا تھا۔

کبھی کبھار حذیفہ کے دل میں بے تکی سی خواہش ابھرتی کہ وہ جویریہ کی جمود بھری زندگی میں کچھ ایسی ہلچل پیدا کرے کہ وہ پھر سے کبھی اپنی ساکت حالت میں واپس نہ جا سکے۔

☼ ☼ ☼

موبائل کی بیپ بہت دیر سے بج رہی تھی۔ عرشی نے پرس کی زپ کھول کر موبائل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"ہیلو۔" عرشی نے فون کان سے لگایا۔

"عرشی! تم کہاں ہو۔" دوسری طرف سے رعنا کی جھلائی ہوئی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"میں اس وقت بیوٹی پارلر میں ہوں' کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"تم بھی حد کرتی ہو' میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم لوگوں کو یتیم بچوں میں تحائف تقسیم کرنے جانا ہے۔ تم پھر بھی پارلر چلی گئیں۔ منیر' باقر اور مسز ترمذی کب سے آئی بیٹھی ہیں۔ صرف تمہارا انتظار ہے۔ فوراً" گھر پہنچو۔" انہوں نے حکم دیا۔

"سوری ممی! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے ان کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کرنا چاہتی ہیں غریبوں کی مدد تو ضرور کیجئے۔ آپ کے لیے اچھی ایکٹوٹی ہے۔ مگر میری اور بھی مصروفیات ہیں۔ میں بالکل نہیں آ سکتی۔" عرشی نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تو رعنا چپ رہ گئیں۔

"آج آ جاؤ بیٹا! وہاں پریس فوٹوگرافرز بھی آئے ہوں گے۔" رعنا نے عرشی کی بے زاری بھانپ کر اپنا لہجہ نرم کر لیا اور اسے ساتھ لے کر جانے کا اصل مقصد بھی بیان کیا۔

رعنا ان بے شمار خواتین میں سے تھیں جو وقت کی فراغت اور وسائل کی فراوانی کے باعث فلاحی کاموں میں مصروف تھیں۔ اب اگر رعنا کی نیت میں تھوڑی سی خود غرضی کا عنصر شامل تھا تو کون سی بڑی بات تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اپنا مطلب پورا کرنے کی غرض سے ہی سہی وہ کچھ ضرورت مندوں کا بھلا بھی تو کر ڈالتی تھیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد سے تو یہ مشغلہ ان کی پسندیدہ ترین مصروفیت بن چکا تھا۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ عرشی کو اس کام کی طرف راغب نہ کر سکیں۔ وہ عجیب من موجی لڑکی تھی۔ موڈ ہوا تو رعنا کی مدد کروا دی۔ نہ ہوا تو صاف انکار۔

"کوشش کر کے تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ بیٹا! ہم تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔" رعنا نے ایک بار پھر سے اسے راضی کرنے کی کوشش کی۔

"آپ میرا بالکل انتظار مت کیجئے' مجھے کم از کم دو گھنٹے اور لگ جائیں گے یہاں۔" عرشی نے اپنے سامنے لگے بڑے سے شیشے میں پیچھے کھڑی لڑکی کا عکس دیکھتے ہوئے کہا جو مہارت کے ساتھ عرشی کے بالوں کی لٹیں پکڑ کر انہیں سلور پنی والے کاغذ میں لپیٹ رہی تھی۔ ابھی بمشکل دو چار لٹیں ہی پنی کی تہوں میں چھپی تھیں' باقی سب بال ابھی رہتے تھے۔

"اور بالفرض اگر میں جلدی فارغ ہو بھی گئی تو میرا کسی یتیم خانے جانے کا بالکل موڈ نہیں۔ اس لیے آپ لوگ پلیز میرے بغیر ہی چلی جائیں۔" عرشی نے کورا جواب دیتے ہوئے فون بند کر کے واپس پرس کے اندر پھینک دیا۔

یہ شہر کا مشہور ترین پارلر تھا۔ بے حد مہنگا اور اس سے بھی زیادہ مصروف۔ دیوار گیر آئینوں کے سامنے لگی کرسیوں میں سے ایک بھی خالی نہ تھی۔ ہر ایک کرسی کے پیچھے حالات کی ستائی کوئی نوجوان لڑکی قینچی یا برش پکڑے ہمہ وقت متحرک رہتی۔ اپنی گھریلو اور ذاتی پریشانیوں کو روزانہ گھر سے پہن کر آئے کپڑوں کی طرح پارلر کے پیچھے والے حصے میں بنے ورکرز ڈریسنگ روم میں اتار کر' جسم پر صاف یونیفارم اور ہونٹوں پر شفاف مسکراہٹ سجا کر یہ لڑکیاں پارلر کے اندر قدم رکھتی تھیں اور پھر یہی لڑکیاں جن کو اپنے خود کے بال سنوار کر سیدھی سادی چوٹی کی صورت میں باندھ لینے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا' سارا دن اپنے ماہر ہاتھوں سے سامنے بیٹھی بیگمات کے بالوں کے منفرد اور انوکھے ہیئر اسٹائل بنانے میں مصروف رہتیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی نے کنگھی کے نوک دار حصے کی مدد سے عرشی کے بالوں کی ایک اور لٹ احتیاط سے اٹھائی اور اسے چمک دار پنی میں لپیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے ملنے والی تنخواہ اور یہاں تک کہ اس کی نوکری کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ وہ اپنا کام کتنی صفائی اور مہارت کے ساتھ کرتی ہے۔

عرشی نے اپنا وقت گزارنے کے لیے سامنے پڑا

فیشن میگزین اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے سبز مخملیں گھاس پر قدم رکھتے ہوئے گہرا سانس لے کر اردگرد پھیلی ہریالی بھری تراوٹ کو اپنے اندر اتارا۔ اس کے نزدیک قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونا ہی ریلیکس کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ اس کو جب بھی موقع ملتا وہ تھوڑا سا وقت کسی باغ یا پارک میں جا کر گزار کر آتا۔

موسم بدل چکا تھا۔ ٹھنڈ اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حذیفہ کافی دیر تک باغ جناح کی نرم گھاس پر چہل قدمی کرتا رہا۔ ایک سستی اور مفت تفریح جس کی افادیت کو گھر بیٹھ کر کمپیوٹر، ٹی وی اور ڈی وی ڈیز میں بوریت کا حل ڈھونڈنے والے نہیں سمجھ سکتے تھے۔

حذیفہ چلتے چلتے وہاں تک آگیا جہاں ایک اونچے پیڑ کے موٹے سے تنے کے قریب بیٹھی لڑکی ہاتھ میں کتاب لیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر حذیفہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ عود آئی۔ اس لڑکی کو کتابوں سے عشق لگتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی کلاس کے علاوہ حذیفہ کو وہ لائبریری کے آس پاس ہی منڈلاتی نظر آیا کرتی تھی۔ اب یہاں آئی تو بھی کتاب ساتھ لے آئی۔

"کہتے ہیں اس کتاب کو ایک بار کھول لینے کے بعد ختم کیے بنا چھوڑ دینا مشکل ہے۔ میں نے بھی اسے ایک ہی نشست میں مکمل کیا تھا۔" حذیفہ اس کے قریب پہنچ کر بولا تو کرنل محمد خان کی بجنگ آمد میں منہ دیے بیٹھی جویریہ ایک دم سے اچھل پڑی۔

اس وقت اس نے گہرے نیلے رنگ کے گرم سوٹ کے اوپر سرخ رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ جس کا کچھ حصہ سوٹ کے ہم رنگ اوڑھی چادر کے نیچے سے دکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی ناک اور گال دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے ہلکے اور گہرے براؤن رنگ کے امتزاج والے بال ہمیشہ کی طرح چٹیا کی شکل میں بندھے ہوئے تھے، جن میں سے دو ریشمی لٹیں پھیل کر اس کے چہرے پر آرہی تھیں۔ عرشی دیکھ لیتی تو صدمے سے فوت ہو جاتی کہ جس شیڈ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے چند دن پہلے ہزاروں روپے خرچ کیے تھے، وہ جویریہ کے بالوں کا قدرتی رنگ ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بالوں کی ہم رنگ تھیں۔ ہلکی براؤن سنہری پن کی لو دیتی ہوئی اور وہ اس وقت انہی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سموئے حذیفہ کو تک رہی تھی۔ حذیفہ کے اس طرح اچانک مخاطب کرنے پر جویریہ کے قریب ہی چادر پر کروٹ کے بل لیٹا ادھیڑ عمر شخص بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"معاف کیجیے گا، میں نے شاید آپ لوگوں کو ڈسٹرب کر دیا۔" حذیفہ نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ نہ جانے اسے یہ شخص پہلے کیوں نہیں نظر آیا تھا۔ شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اتنا ہی دیکھتا ہے جتنا وہ دیکھنا چاہتا ہے۔

"یہ حذیفہ ہیں بابا! یہ بھی لمز میں ہوتے ہیں۔"

"اچھا... اچھا کھڑے کیوں ہو بھئی۔ آؤ بیٹھو ہمارے ساتھ۔" جویریہ کے والد اس کے بارے میں جان لینے کے بعد بشاشت سے بولے۔

"مجھے ندیم اسلم کہتے ہیں۔" حذیفہ کے بیٹھنے کے بعد جویریہ کے والد نے بھی اپنا آدھا ادھورا تعارف مکمل کرایا۔ "جویریہ کے کلاس فیلو ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں اس سے کافی سینئر ہوں۔ ایم بی اے کر رہا ہوں۔" حذیفہ بتایا۔

"ہوں... بہت — خوب۔" ندیم صاحب بولے۔ "ارے جویریہ! اپنے دوست کو کچھ کھلاؤ پلاؤ تو سہی۔" انہوں نے جویریہ کی طرف رخ کر کے کہا جو خاموشی سے چادر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

جویریہ نے پاس رکھے شاپر میں سے کھانے پینے کی اشیا نکالنی شروع کیں۔ چیزیں نکالنے کے دوران وہ بار بار چہرے پر آنے والی لٹوں کو کانوں کے پیچھے پھنسا کر قید کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ پھر سے پھسل کر گالوں پر آگرتیں۔

"آپ غالباً" راہوالی میں ہوتے ہیں؟" حذیفہ نے جویریہ پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا، اسے معلوم تھا کہ چھٹی والے دنوں میں جویریہ اکثر اپنے گھر راہوالی چلی جاتی ہے۔

"غالباً" نہیں یقیناً"۔" ندیم صاحب نے جواب دیا۔ "اور تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"میں تو یہیں لاہور میں رہتا ہوں۔" حذیفہ نے بتایا۔

"ہوں۔" ندیم صاحب نے اسے غور سے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر بجنگ آمد اٹھالی جسے جویریہ نے حذیفہ کے آنے پر نیچے رکھ دیا تھا۔

"تو کیا کہہ رہے تھے تم! کہ تم نے اس کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کیا تھا۔" وہ کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے بولے۔ "کبھی میرا بھی یہی طریقہ ہوا کرتا تھا کسی اچھی کتاب کو ختم کیے بنا چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو آدھے پونے گھنٹے سے زیادہ کچھ پڑھ لوں تو سر دکھنے لگتا ہے حالانکہ یہ میری پسندیدہ ترین کتابوں میں سے ایک ہے، کئی بار پڑھ چکا ہوں پھر بھی جب کبھی موڈ بنتا ہے۔ کہیں سے کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ آج بھی ساتھ اسی لیے لایا تھا کہ اچھے موسم میں اچھی کتاب کا ساتھ ہو گا تو تفریح کا مزا دوبالا ہو جائے گا پر وہ جو کہتے ہیں نا کہ عمر کے ساتھ انسان کی عقل بھی کم ہو جاتی ہے، بالکل صحیح کہتے ہیں اب دیکھو اتنی دور سے کتاب تو اٹھا کر لے آیا مگر چشمہ گھر بھول آیا ہوں۔ اسی لیے جویریہ کی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے کہ پڑھ کر سنائے، اب تو یہ بھی بے چاری تھک گئی ہے۔" ندیم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لائیے! اس سے آگے میں پڑھ کر سناتا ہوں۔" حذیفہ نے کتاب ندیم صاحب کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے شروع کروں؟"

"جہاں سے دل کرے شروع کر دو۔ لیکن پہلے تم کچھ لو تو سہی۔" ندیم صاحب نے ان بسکٹوں اور سینڈوچ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو جویریہ نے شاپر سے نکال کر سامنے رکھے تھے۔

"جی نہیں، میں اس وقت کچھ نہیں لوں گا۔" حذیفہ نے منع کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی پی سی سے کافی کچھ کھا پی کر آیا تھا جہاں اسے دانش ایک میٹنگ میں لے گئے تھے۔ میٹنگ کے بعد دانش گھر کے لیے نکل گئے جبکہ حذیفہ یہاں آگیا۔

"کچھ نہ کچھ تو تمہیں چکھنا ہی پڑے گا، ورنہ ہم بھی تم سے کچھ نہیں سنیں گے۔" ندیم صاحب نے دھونس جمائی تو حذیفہ ہنس پڑا۔

"چلیے! آپ کے کہنے پر یہ لے لیتا ہوں۔" حذیفہ نے سامنے رکھا ایک چاکلیٹ بسکٹ اٹھا لیا۔

"بابا! آپ بھی تو کچھ کھا لیجیے۔" پاس سے ہی جویریہ کی آواز ابھری۔

"نہیں۔ اس وقت دل نہیں کر رہا۔" ندیم صاحب نے کہا۔

"پلیز بابا! بس ایک سینڈوچ۔" کچھ تو تھا جویریہ کے ملتجی انداز میں جس نے حذیفہ کو متوجہ کیا، اس نے غور سے ندیم صاحب کی طرف دیکھا۔

وہ پینتالیس اور پچاس کی درمیانی عمر کے دبلے پتلے آدمی تھے جن کے بالوں میں اب سیاہی کی جگہ سفیدی کا رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔ لیکن یہ ندیم صاحب کے بالوں میں جا بجا چھلکتی سفیدی نہیں بلکہ ان کی نقاہت تھی جو حذیفہ کو پہلی نظر میں ہی کھٹکی تھی۔ یہ وہ دبلا پن نہیں تھا جو انسان میں قدرتی طور پر ہوتا ہے بلکہ اس ناتوانی کے آثار تھے جو کسی بیماری کے بعد کمزوری کی شکل میں انسانی جسم پر وارد ہوتا ہے۔ ندیم صاحب کو کیا مرض لاحق تھا، یہ حذیفہ کو نہیں پتا تھا لیکن جویریہ کی پریشانی کو وہ سمجھ سکتا تھا، یہی پریشانی دانش اور خود اس کے اپنے چہرے پر بھی عود آتی تھی جب کبھی اسمارہ کی طبیعت ذرا سی بھی خراب ہو جاتی تھی۔

حذیفہ نے ہاتھ میں پکڑا بسکٹ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"اگر آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی آپ کو کتاب پڑھ کر سناؤں گا۔"

"واہ برخوردار! ہمارا داؤ ہم ہی پر چلا رہے ہو۔

بہت چالاک ہو۔" وہ ہنسے۔

حذیفہ نے تین پیپر پلیٹس میں ایک ایک سینڈوچ اور دو بسکٹ نکال کر رکھے۔

"تم نے تو راشن کارڈ پر ملنے والے سامان کی طرح مال بانٹا ہے۔" ندیم صاحب یہ برابر کی تقسیم دیکھ کر خوب محظوظ ہوئے۔ وہ آدمی مزے دار تھے۔ زندہ دل اور خوش مزاج۔ منٹوں میں یوں بے تکلف ہو جانے والے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ (یہ جویریہ پتا نہیں کس پر چلی گئی تھی؟)

"تم نے شرطیں ہی اتنی کڑی رکھ دی ہیں کہ اب تو کھانا ہی پڑے گا۔" ندیم صاحب نے ہار مانتے ہوئے پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جب تک میں کرنل صاحب کو موصل سے قاہرہ پہنچاتا ہوں، آپ یہ سب کچھ ختم کیجیے۔" حذیفہ نے کتاب کھولتے ہوئے ان سے کہا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے سرمئی رنگ کی گرم شال کو جس کے بارڈر پر نہایت باریک بیل کڑھی ہوئی تھی، اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹا۔ اس کا پسندیدہ ترین موسم تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا جب صبح سویرے گھاس پر شبنم کے قطروں کی تہہ یوں جمی ہوئی ملتی جیسے کوئی رات میں سبزے پر چاندنی کا چھڑکاؤ کر گیا ہو۔

صبح کے وقت اوس کی سفیدی اوڑھ کر لیٹے سبزے پر ٹھہری دھند کے پردے میں سے لمز کی لال اینٹوں والی پرشکوہ عمارت عجیب پر اسرار سی دکھتی۔ پھر دھوپ چڑھنے کے ساتھ جہاں زمین پر پڑی اوس غائب ہونے لگتی وہیں یونیورسٹی کے ماحول پر چھائی پر اسراریت اور خاموشی کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جگہ جگہ اس ماحول میں رنگ و رعنائی بھرتے ہوئے طلباء طالبات کے غول در غول دکھائی دینے لگتے۔ سکوت کی جگہ آوازوں اور قہقہوں کا شور چہار سو بکھرنے لگتا۔

جویریہ نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اپنا بھاری بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کیا، اس بیگ میں اس کا موٹا سا رجسٹر رکھا ہوتا تھا، وہ ان طلبا میں سے تھی جو لیکچر کے دوران استاد کی ہر بات نوٹ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جنہیں ذہین ہونے کے باوجود اپنے حافظے پر مکمل اعتماد نہیں ہوتا۔

ڈائننگ سینٹر کے باہر اسٹوڈنٹس کا رش لگا ہوا تھا۔ ہنستے مسکراتے، بے فکرے نوجوان لڑکے لڑکیاں جو جویریہ جیسی لڑکیوں کی پالی بے اعتمادیوں سے کوسوں دور تھے اور ان سب کے درمیان، ان سب میں نمایاں اور سب سے منفرد حذیفہ دانش علی تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں کو کالی لیدر جیکٹ کی جیبوں میں گھسائے کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہا تھا۔ حذیفہ ان لوگوں میں سے تھا جن پر قدرت دل کھول کر مہربان ہوتی ہے، جو ذہانت اور وجاہت کا مرکب ہوتے ہیں، جو جہاں بھی جائیں سب کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، ان کی ستائش کے حق دار ٹھہرتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بدولت اپنا آپ منوا کر ہی رہتے ہیں۔

ایک طرف حذیفہ، زندگی سے بھرپور، باصلاحیت اور بے مثال، مجمع میں کھڑا ہوا بھی دور سے دکھائی دے جائے اور دوسری طرف وہ.... جویریہ ندیم، خاموش، سنجیدہ اور غیر اہم جو اپنے کندھے سے لٹکتے بیگ کے اسٹریپ کو مضبوطی سے تھامے ڈھیر سارے ہنستے مسکراتے طلبا کے بیچ میں سے گزر کر نکل گئی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔

☼ ☼ ☼

پڑھائی اپنے معمول کے مطابق جاری تھی۔ ساتھ میں غیر نصابی سرگرمیاں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ ایسے میں ڈرامہ فیسٹیول کی آمد نے طلبا کے جوش و خروش میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

جویریہ ان ساری سرگرمیوں سے دور ہی رہا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایک انگریزی پلے کے دیسی ورژن والے ڈرامے میں اس کا بھی چھوٹا سا رول تھا جسے

علاقائی رومان کا رنگ دے کر پیش کیا جارہا تھا۔ یہ رول بھی اس کے سر زبردستی منڈھا گیا تھا۔ اس نے ہر طرح کا بہانہ گھڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کی مگر خدیجہ نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ خدیجہ، جویریہ کی کلاس فیلو اور ڈرامہ سوسائٹی کی سرگرم عمل ممبر تھی۔

"مگر مجھے تو بالکل ایکٹنگ نہیں آتی۔" جویریہ نے ہر طرح سے جان چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد کہا۔

"تمہیں ایکٹنگ کرنی بھی نہیں ہے۔ تم ہمارے ڈرامے کی دلہن ہو۔ تمہیں بس دس منٹ تک آنکھیں نیچی کرکے چپ چاپ بیٹھے رہنا ہے۔ نہ کوئی ڈائیلاگ، نہ کوئی موومنٹ۔ اس سے زیادہ سمپل رول تو ہو ہی نہیں سکتا۔" خدیجہ نے اسے تسلی دی۔

"تم پلیز کسی اور کو دلہن بنالو۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہمیں پٹھان دلہن چاہیے اور تمہارا رنگ روپ بالکل پٹھانوں والا ہے۔ دلہن تو تم ہی ہوگی۔" خدیجہ نے قطعی لہجے میں کہہ کر بات ختم کردی۔

خدیجہ نے ٹھیک کہا تھا۔ ڈرامے والے دن تھوڑی پر آئی لائنر کی مدد سے تلوں کا تکون بنائے وہ سچ مچ کی پٹھان لگ رہی تھی۔ اس کے گلے اور بازوؤں میں چاندی کے زیورات لدے تھے۔ ایک بھاری سا چاندی کا سیٹ خدیجہ نے پنوں کی مدد سے اس کے ماتھے پر بھی ٹانگ دیا جس کی لڑیاں بار بار ڈھلک کر جویریہ کی آنکھوں پر آجاتی تھیں۔

"آج کل کون سی پٹھانی ایسے کپڑے اور زیور پہن کر شادی کرتی ہے؟" آنکھوں پر پھسل آنے والے سیٹ کو چوتھی بار ہاتھ سے اوپر کرتے ہوئے جویریہ نے زچ ہوکر کہا۔

"ہمارے ڈرامے کی دلہن پہنتی ہے۔ ایک منٹ ہلنا مت گواب نہیں گرے گا۔" خدیجہ نے بھاری سیٹ میں دو تین پنیں اور گھسا کر اسے جویریہ کے سر کے ساتھ مضبوطی سے جمادیا۔

"بس تیار رہو پانچ منٹ میں تمہاری انٹری ہے۔"

خدیجہ یہ ہدایت دے کر اس طرف چلی گئی جہاں ڈرامے کے ابتدائی سین کے اداکار پختونوں والی شلواریں پہنے اور سر پر اونچے شملے باندھے اسٹیج کے پاس کھڑے تھے۔

جویریہ کا رول واقعی سیدھا سادہ سا تھا، اسے صرف سر جھکا کر دس منٹ تک اسٹیج پر رکھے گاؤ تکیوں اور ڈھیر سارے کشنز کے درمیان سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے بیٹھنا تھا۔ اس کے باوجود جویریہ کے دل میں اپنے رول کو لے کر طرح طرح کے واہم آرہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس رول میں بھی گڑبڑ کرنے کا اعلا ریکارڈ قائم کرے گی جس میں گڑبڑ ہونے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ گڑبڑ کئی قسم کی ہوسکتی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسٹیج پر چل کر جاتے ہوئے کسی چیز میں اس کا پیر الجھ جائے اور وہ سب کے سامنے الٹ کر گر پڑے یا پھر یہ کہ دلہن بن کر بیٹھے ہوئے اسے اچانک چھینکیں شروع ہوجائیں جو بند ہونے کا نام ہی نہ لیں۔ اس طرح کے کئی الٹے سیدھے خیالات تھے جو اس کے ذہن میں آکر اس کے پیٹ میں ہونے والی گدگدیوں میں اضافہ کررہے تھے۔

جویریہ نے اسٹیج کے کونے سے تھوڑا سا جھانک کر باہر پنڈال میں دیکھا جو مختلف یونیورسٹی کے عہدے داروں اور پرفارم کرنے والے اسٹوڈنٹ کے والدین رشتہ داروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نک سک سے تیار عورتیں اور مرد پروگرام شروع ہونے کے انتظار میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں صرف پہلی دو قطاروں میں بیٹھے لوگ جویریہ کو مکمل طور پر دکھائی دے رہے تھے اس کے پیچھے تو بس سر ہی سر تھے یہ ماحول ان ریہرسلز سے بہت مختلف تھا جن میں ڈرامے سے منسلک لڑکے لڑکیوں کے علاوہ شاذونادر ہی کوئی اور موجود ہوتا تھا۔

جویریہ کی ہتھیلیوں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگے اور دل بے تحاشہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹی۔

"جویریہ! تم ریڈی ہونا۔ امیرہ اور توصیف کی لائنیں ختم ہوتے ہی تمہیں اسٹیج پر جانا ہے۔" خدیجہ نے اچانک پیچھے سے آکر اس سے کہا۔

"میں اسٹیج پر نہیں جاؤں گی۔" اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ جویریہ سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔

"واٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" خدیجہ بھونچکی رہ گئی۔

"میں اسٹیج پر نہیں جاسکتی۔ پلیز مجھے فورس مت کرو۔" جویریہ نے ملتجی نگاہوں سے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو نیم وحشت کے عالم میں آنکھیں پھاڑے جویریہ کو تک رہی تھی۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہیں جانا پڑے گا۔" خدیجہ نے جویریہ کا بازو یوں کھینچا جیسے وہ اسے زبردستی گھسیٹتی اسٹیج پر لے جائے گی۔ جویریہ نے جھٹکا دے کر اپنا بازو خدیجہ کے ہاتھوں سے چھڑالیا۔

"جویریہ۔" خدیجہ نے جویریہ کی اس حرکت پر بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے تنبیہاً کہا۔ پر جویریہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ خوف سے اس کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ اس نے اچانک پیچھے مڑ کر دوڑ لگا دی۔

حذیفہ کا کسی ڈرامے میں کوئی رول نہیں تھا لیکن اس کا دوست نصیر ڈرامے میں ایک کردار نبھا رہا تھا۔ حذیفہ اسی کے ساتھ آیا تھا۔ نصیر کو اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر ڈرامے میں بولے جانے والے اتنے ہی لمبے ڈائیلاگ یاد کرتا چھوڑ کر حذیفہ اپنی سیٹ کی طرف واپس جارہا تھا جب جویریہ گولی کی رفتار سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔

گھیرے دار فراک میں ملبوس، سر سے پیر تک علاقائی زیورات میں لدی ہوئی وہ اس وقت واقعی کوئی پہاڑن لگ رہی تھی جو راستہ بھول کر اس انجان نگری میں آنکلی ہو اور اب اپنی اس غلطی پر پریشان ہو۔

اردگرد ڈراموں میں استعمال ہونے والے کپڑوں، کاغذوں اور دوسری بے شمار فالتو اشیا کے ڈھیر لگے تھے۔ ان سب چیزوں کے درمیان کھڑی جویریہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی اپنے لیے فرار کا راستہ تلاش کررہی تھی۔ اس سے پہلے کہ جویریہ ایسا کوئی راستہ ڈھونڈ پاتی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آتی خدیجہ بھی جویریہ کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

"جویریہ! تم اس طرح سے بیک آؤٹ نہیں کرسکتیں۔ چلو میرے ساتھ۔"

خدیجہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک بار پھر سے کھینچنے لگی۔ جویریہ بھی اتنی ہی قوت سے اپنے آپ کو خدیجہ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش میں لگی تھی۔ حذیفہ نے ہکا بکا ہوکر دونوں لڑکیوں کی کھینچا تانی کو دیکھا۔

"ایک منٹ۔ مسئلہ کیا ہے؟" وہ ایک دم سے بیچ میں آیا۔

"جویریہ کو ڈرامے میں دلہن کا رول کرنا ہے۔ ڈیڑھ منٹ کے بعد اس کی انٹری ہے اور یہ بھاگ کر یہاں آگئی ہے۔" خدیجہ نے حذیفہ کو بتایا اور پھر واپس جویریہ کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"صرف دس منٹ کی بات ہے۔ فوزیہ اور ریحانہ مستقل تمہارے ساتھ رہیں گی۔" خدیجہ نے ان دونوں لڑکیوں کے نام لیے جنہیں دلہن بنی جویریہ کو دائیں بائیں سے پکڑ کر اسٹیج پر لے جانا تھا۔

"اگر تم نروس ہورہی ہو تو کوئی بات نہیں۔ ڈری سہمی دلہن تو اور بھی اچھی لگے گی۔" بات کے اختتام تک خدیجہ کا لہجہ جارحانہ سے التجائیہ ہوچکا تھا۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" جویریہ نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی، وہ خود کو خدیجہ سے چھڑا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں کے گرد دونوں بازو سختی سے لپیٹ لیے۔

"او گاڈ۔ اب میں کیا کروں۔" خدیجہ نے سر پکڑ کر

کہا۔ وہ بالکل رونکھی ہوچکی تھی۔

آگے اسٹیج پر ایکٹر اپنے وہ ڈائیلاگ ختم کررہے تھے جن کے بعد دلہن کو لایا جانا تھا۔ اگر اگلے ایک منٹ کے اندر دلہن اسٹیج پر نہیں پہنچتی تو وہ لوگ اتنے منجھے ہوئے اداکار نہیں تھے کہ گھبرائے یا سٹپٹائے بغیر سچویشن سنبھال پاتے۔ جویریہ کی اس حرکت سے پورا ڈرامہ بگڑ سکتا تھا۔ خدیجہ کی پریشانی بجا تھی۔

حذیفہ نے ایک نظر خدیجہ کے پریشان چہرے پر ڈالی اور پھر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی جویریہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تم اسے اگلے ایک منٹ میں اسٹیج پر جانے کے لیے راضی کرسکو گی۔ بہتر ہے کہ تم اس کے بغیر ہی مینج کرلو۔" حذیفہ نے خدیجہ کو مشورہ دیا۔

خدیجہ نے ایک سیکنڈ کے لیے حذیفہ کی طرف دیکھا پھر مڑ کر فل اسپیڈ بھاگتی ہوئی واپس اسٹیج کی طرف چلی گئی۔

اگلے تیس سیکنڈ کے اندر کاسٹیومز میں مدد کروانے کے لیے ساتھ آئی ایک اور کلاس فیلو کو ریحانہ اور فوزیہ کی معیت میں دلہن بنا کر آگے بھیج دیا گیا۔ کپڑے اور جیولری پہنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بس جلدی سے ایک بڑا سا زرتار دوپٹہ ڈھونڈ کر سر پر ڈالا لمبا سا گھونگھٹ نکالا اور دلہن تیار۔

اسٹیج پر موجود اداکاروں کو اگر دلہن کے حلیے میں کوئی تبدیلی نظر آئی تو انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرامے کے دوران اس پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

جویریہ اب تک گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اسے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے چھوڑے رول کو کیسے پُر کیا گیا ہے اور کس نے پُر کیا ہے۔ اس نے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے تھے اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ حذیفہ کو جویریہ پر شدید غصہ آیا۔

"کبھی کبھار انسان کو اپنے لیے نہ سہی' دوسروں کی خاطر ہی اپنے خوف پر قابو پالینا چاہیے' خاص طور پر جب ان دوسروں میں آپ کے دوست بھی شامل ہوں۔ تمہیں احساس ہے کہ تمہاری اس حرکت کی وجہ سے تمہارے ساتھیوں کی ساری محنت مٹی میں مل سکتی تھی؟ کیا بگڑ جاتا تمہارا اگر تم تھوڑی دیر کے لیے اسٹیج پر چلی جاتیں۔" حذیفہ نے انتہائی سرد لہجے میں جویریہ سے کہا۔

"میں وہاں نہیں جاسکتی تھی۔" جویریہ کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی جو بمشکل حذیفہ تک پہنچی۔ وہ سر سے پیر تک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی مگر حذیفہ کو اس پر اس وقت ترس نہیں آرہا تھا۔ وہ خود یاروں کا یار تھا۔ دوستی میں بے ایمانی اسے برداشت نہیں تھی۔

"کیوں نہیں جاسکتی تھیں؟" وہ درشتی سے بولا۔

"کیونکہ اسٹیج کے سامنے میری ماں بیٹھی ہوئی ہے۔" گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی جویریہ نے ایک دم سے سر اٹھا کر زور سے کہا تو حذیفہ بھونچکا رہ گیا۔

"وہ وہاں سب سے آگے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ وہیں بیٹھی ہیں۔" جویریہ بے ربط سے انداز میں بولی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ مگر یہ خوف اسٹیج پر جاکر پرفارم کرنے کا نہیں تھا بلکہ اس عورت کا تھا جو جویریہ کی ماں تھی اور سامنے کی قطاروں میں کہیں بیٹھی تھی۔

حذیفہ بھی کچھ دیر پہلے تمام حاضرین پر نظر ڈال چکا تھا۔

سامنے والی کرسیوں پر مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور سربراہان کے علاوہ کئی دوسرے مہمان بھی شامل تھے جن میں اتفاق سے خواتین کی ہی اکثریت تھی۔

ان عورتوں میں اعلا ڈگریاں رکھنے والی پروفیسروں سے لے کر بھاری زیورات کی نمائش سے اپنی امارت کا اظہار کرتی عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان میں سے کون سی جویریہ کی ماں تھی' اس کا اندازہ حذیفہ نہیں لگا سکتا تھا بلکہ اسے تو ان میں سے کوئی بھی عورت نہ تو

جویریہ کی ماں کے خانے میں فٹ ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی اور نہ ہی ندیم صاحب جیسے کسی شخص کی بیوی لگ رہی تھی۔

"مجھے یہاں سے جانا ہے ابھی اسی وقت۔" زمین پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہوئی جویریہ نے کہا۔

حذیفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے مگر جویریہ کی شکل دیکھ کر کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل دیا۔

"ٹھیک ہے' چلو۔" وہ بس اتنا بولا۔

"جویریہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے واپس ہاسٹل چھوڑنے جارہا ہوں۔" اسٹیج کے سائڈ سے نکل کر جاتے ہوئے حذیفہ نے خدیجہ کو بتایا۔ جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی اسٹیج پر چلنے والے اپنے ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔

حذیفہ کی بات پر خدیجہ نے مڑ کر جویریہ کی طرف دیکھا جس کا بازو حذیفہ کی گرفت میں تھا اور وہ کسی بے جان گڑیا کی مانند اس کے ساتھ کھنچتی چلی آرہی تھی۔

"جو مرضی کرو۔ میری بلا سے۔" خدیجہ نے یہ کہہ کر توجہ واپس ڈرامے کی طرف کرلی۔

خدیجہ نے اس ڈرامے پر بے انتہا محنت کی تھی۔ لباس اور اداکاروں کے چناؤ سے لے کر ڈائیلاگ اور سیٹ کی بناوٹ تک ہر چیز میں کا خیال رکھا تھا۔

اس نے جویریہ کا دلہن کے طور پر انتخاب اس لیے کیا تھا کیونکہ جویریہ کا بھولا بھالا چہرہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا تھا اور یہی خدیجہ کا مقصد تھا کہ حاضرین کا دھیان کسی صورت بھی ڈرامے سے ہٹنے نہ پائے۔

پر اب جویریہ کی جگہ گھٹنوں تک گوٹے والے دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بیٹھی ہوئی اس ایمرجنسی کی دولہن کو دیکھ کر جس کی قمیص کا رنگ بھی اس کے اوڑھے آنچل کے ساتھ ٹھیک سے میچ نہیں کررہا تھا۔ خدیجہ کو اپنے ڈرامے کا بیڑہ غرق ہوتا نظر آرہا تھا۔

اس کا موڈ تو لازمی آف ہونا تھا۔

باہر نکلتے ہی خنک ہوا کا ایک جھونکا جسم کو چھو کر گیا تو جویریہ لاشعوری طور پر ہلکا سا کپکپائی۔

حذیفہ جویریہ کو گاڑی میں بٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ گاڑی چلنے کے ساتھ جویریہ کے ماتھے پر ٹکے چاندی کے ہار کی لڑیاں بھی آگے پیچھے ہو کر جھولنے لگیں۔

"تمہاری والدہ کو تمہارا ڈرامے میں کام کرنا پسند نہیں ہے کیا؟" حذیفہ نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالتے ہوئے جویریہ سے پوچھا۔

بہت سوچ کر اسے جویریہ کے خوف و گھبراہٹ کی یہی ایک وجہ سمجھ میں آئی کہ وہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہ سب کررہی تھی۔ ندیم صاحب تو حذیفہ کو ایسی معمولی باتوں پر پابندیاں لگانے والے شخص نہیں لگتے تھے۔ کیا پتا اس کی ماں سخت گیر عورت ہو؟

"مجھے نہیں معلوم انہیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔ میں دو سال کی بھی نہیں تھی جب وہ مجھے اور بابا کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔" حذیفہ کے ساتھ والی سیٹ پر جھکے سر کے ساتھ بیٹھی ہوئی جویریہ نے آہستہ سے اسے بتایا۔

"آئی سی۔" حذیفہ نے ہونٹ بھینچے۔

اسے یکدم احساس ہوا کہ وہ جویریہ اور اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے۔ اس نے کبھی یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ باپ بیٹی کے اس سیٹ اپ میں ماں جیسی اہم ہستی شامل نہیں ہے۔ وہ کسی کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کا قائل نہیں تھا مگر جویریہ کا رویہ اس کے لیے الجھن کا باعث تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے اوور ری ایکٹ کیا ہے؟" حذیفہ نے سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر جویریہ سے پوچھا۔

"تمہارے والدین میں علیحدگی ہوگئی۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے لیکن بہت سے لوگوں کے والدین ایک ساتھ نہیں رہتے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے ماں یا باپ کو اچانک سامنے دیکھ کر اتنے شدید رد عمل کا اظہار نہیں کرتا جس طرح تم نے کیا۔"

"ان میں سے کسی کے ماں باپ نے ان کو اس طرح ذلیل نہیں کیا ہوگا جس طرح میری ماں نے مجھے کیا تھا۔"

جویریہ بولی تو حذیفہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پر وہ چہرہ دوسری طرف کیے کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے لپکنے والے بجلی کے کھمبوں کو دیکھ رہی۔

"سب کو یہی لگتا ہے کہ میرے والدین کے درمیان علیحدگی ہو جانا ایک افسوس ناک بات ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں کی شادی کا ہونا اس سے بھی زیادہ افسوس ناک امر تھا جسے کبھی ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔" جویریہ نے کھڑکی پر سے نظریں ہٹائے بنا کہا۔

وہ اب پہلے کی نسبت کافی بہتر تھی بلکہ حذیفہ نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گاڑی اور آڈیٹوریم کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا اس کے خوف و ہراس میں بھی بتدریج کمی آتی جا رہی تھی۔

سردیوں میں دن انتہائی مختصر ہو جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دن ابھی پوری طرح چڑھا بھی نہیں اور رات بھی گیا جب حذیفہ یہاں آ رہا تھا تو گاڑی سے باہر سڑک کے ساتھ دوڑتے درختوں اور بجلی کے اونچے کھمبوں کے لمبے سائے زمین پر دور تک لیٹے نظر آ رہے تھے۔

سورج افق کے پار اترنے کی تیاری پکڑ رہا تھا اور اس کی الوداع کہتی کمزور شعاعوں نے ہر چیز کو اصل اور پرچھائیں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور اب جب وہ جویریہ کو لے کر ان ہی راستوں سے واپس جا رہا تھا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ زمین پر دم سادھے لیٹی پرچھائیوں نے سورج کے جاتے ہی اٹھ کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ڈھلتی شام کا ماحول حذیفہ کو ہمیشہ اداس لگتا تھا اور سردیوں کی اس افسردہ رات کو اس رنجیدہ سی لڑکی نے اور بھی زیادہ افسردہ بنا دیا تھا۔

"سنا ہے میرے نانا اپنے علاقے کے بہت با اثر آدمی تھے۔" حذیفہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی جویریہ نے جیسے خود کلامی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"صاحب حیثیت ہونے کے علاوہ وہ نہایت فیاض اور غریب پرور شخص بھی تھے۔ زکوٰۃ اور خیرات پانے والوں کی ایک لمبی قطار تھی جو ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ ان کے دروازے پر جمع ہوتی تھی۔ نانا کی فراخ دلی صرف پیسے تک محدود نہیں تھی۔ وہ عملی طور پر بھی لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔" جویریہ نے شیشے کی کھڑکی کے ساتھ ماتھا ٹکتے ہوئے حذیفہ کو بتایا۔

"بابا' نانا کے کسی ایسے دوست کے بیٹے تھے جنہیں حیثیت میں کم ہونے کے باوجود ان کی دوستی نے نانا کے ساتھ برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ اپنے عزیز دوست کے انتقال کے بعد ان کے یتیم بیٹے کی پرورش کا ذمہ نانا نے اپنے سر لے لیا۔

نانا کے زیر سایہ ہی پل کر بابا جوان ہوئے۔ نانا نے انہیں پڑھایا لکھایا اور پھر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ایک ادارے میں نوکری بھی دلوا دی۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ گھر میں بھونچال اس وقت آیا جب نانا نے اپنی نازوں پلی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ بابا کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔

اپنے مرحوم دوست کا لحاظ کرتے ہوئے نانا نے بے شک بابا کو کم حیثیت نہ سمجھا ہو مگر باقی گھر والوں کے لیے بابا کی حیثیت ان خیراتیوں سے کم نہیں تھی جو ہر مہینے گھر کے دروازے پر راشن لینے جمع ہوتے تھے۔

بابا ایک سلجھے ہوئے محنتی انسان تھے۔ پھر بھی یہ رشتہ امی کے لیے ناقابل قبول تھا۔ ہر لڑکی کی طرح انہوں نے بھی اپنے ہونے والے شریک سفر کے بارے میں بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کی سنگت قبول کر لیتیں جو ان کے باپ کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہوا تھا۔ انہوں نے خوب واویلا مچایا پر نانا نے ان کی ایک نہ سنی۔ بہت ساری خوبیوں کے ساتھ نانا میں ایک خامی بھی تھی جو ہر مطلق العنان شخص میں ہوتی ہے۔

انہیں اپنے کیے گئے فیصلوں سے انحراف بالکل گوارا نہیں تھا۔

باقی گھر والوں کو بھی اس رشتے میں سو طرح کے نقص نظر آتے تھے۔ لیکن وہ اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تمام جاگیریں' تمام اثاثے نانا کے ہاتھ میں تھے۔ خاندان والے اپنی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نانا پر انحصار کرتے تھے۔ جس شخص کے ہاتھ میں دولت کی طنابیں ہوں اس کی حیثیت اس کوچوان کی سی ہوتی ہے۔ جو زندگی کی بگھی اور اس میں سوار لوگوں کو جب چاہے' جہاں چاہے موڑ کر لے جائے اور کوئی کچھ بھی نہ کر سکے۔

نانا نے بھی ایسا ہی کیا۔

امی کا سارا شور شرابا بے کار گیا اور بابا سے ان کی شادی کروا دی گئی۔ اس رشتے کے پیچھے نانا کی کیا سوچ تھی' یہ کوئی نہیں جانتا پتا نہیں انہوں نے امی کی شادی بابا کے ساتھ کر کے بابا کو عزت بخشی تھی یا پھر اپنی اکھڑ مزاج بیٹی کا ہاتھ بابا کے ہاتھ میں دے کر اس کا مستقبل محفوظ کیا تھا۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ امی کی بد زبانی اور بد تمیزیوں کو برداشت کرنے کے لیے بابا سے زیادہ متحمل مزاج اور صابر شخص کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

امی کا مستقبل محفوظ ہوا یا نہیں پر اس شادی کے بعد بابا کی زندگی عذاب بن گئی۔

اگلے دو سال بابا کی زندگی کے بد ترین سال تھے۔ جاگیردارانہ نظام اور مغرور رویوں کے درمیان پل کر جوان ہونے کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ عزت بھی نہیں ملی تھی لیکن جو ذلت امی اور ان کے باقی گھر والوں کی طرف سے انہیں شادی کے بعد برداشت کرنی پڑی اس کا تصور بھی کرنا مشکل ہے۔ پر نانا کے ان گنت احسانوں کے بوجھ تلے دبے بابا کی زبان پر ایک بار بھی حرف شکایت نہ آیا۔

امی اور بابا کی شادی کے تین سال کے بعد ایک رات نانا کو دل کا شدید دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ چکے تھے۔

نانا کی اس آنا "فانا" موت کے بعد جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئیں وہاں یہ نام نہاد رشتہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

نانا کی موت اس تالے کی چابی ثابت ہوئی جس نے امی اور بابا کو اس تعلق میں قید کر رکھا تھا۔ نانا نہیں رہے تو سارے قفل اپنے آپ ہی کھل گئے۔ امی نے خلع کا دعوا دائر کر دیا۔

جاتے وقت وہ بابا کے لیے تلخ یادوں کے علاوہ کچھ اور بھی چھوڑ کر گئیں اور وہ کچھ اور میں تھی۔" جویریہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ حذیفہ کو سننے میں دشواری پیش آ رہی تھی مگر اس نے جویریہ کو ٹوکا نہیں، بولنے دیا اور خود خاموشی سے سنتا رہا۔

"نانی اور ماموں وغیرہ کا خیال تھا کہ میرا وجود امی کے آنے والی زندگی میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔" جویریہ چٹختے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیونکہ میں اپنی ماں کی خوشیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی اس لیے فیصلہ یہ کیا گیا کہ مجھ سے جتنی جلدی جان چھڑالی جائے' اتنا اچھا ہے اور جان چھڑانے کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جس کا خون ہے اسی کے حوالے کر دیا جائے۔"

بابا نے اس ذمہ داری کو بخوشی قبول کر لیا۔ امی کے برعکس میرا وجود ان کے لیے بے حساب خوشی و انبساط کا باعث تھا۔ انہوں نے میرے لیے وہ سب کچھ کیا جو کوئی ماں اپنے بچے کے لیے کرتی ہے چاہے وہ راتوں کو گود میں اٹھا کر لوری دے کر سلانا ہو یا پھر اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر کھانا کھلانا ہو۔ ماسوائے ان چند گھنٹوں کے جب بابا آفس جاتے وقت مجھے پڑوس کی ایک عمر رسیدہ خاتون کے پاس چھوڑ کر جاتے' وہ اپنا سارا وقت میرے ساتھ بتاتے تھے۔

لیکن یہ اولاد بھی کتنی ناشکری ہوتی ہے نا۔" جویریہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔ "والدین کے پیار' ان کی قربانیوں کی قدر ہی نہیں کرتی۔ بابا کے اتنے پیار' اتنی توجہ کے باوجود میرے اندر ایک بے چینی رہتی تھی جو مجھے کسی کمی کا احساس دلاتی۔ ایک ایسی تشنگی جسے بابا کی محبتوں کی بوچھاڑ بھی سیراب کرنے میں ناکام ہو گئی۔

سب سے پہلے میں نے اسکول اور محلے کے بچوں سے اس توجہ کو پانے کی کوشش کی۔ میں زبردستی ان کے کھیلوں میں شامل ہوتی تو کبھی بن بلائے ان کے ساتھ جا کر بیٹھتی۔

میری حالت اس بھکاری جیسی تھی جو توجہ حاصل کرنے کے لیے بار بار مخاطب کر کے زچ کر دیتا ہے۔

بچے مجھ سے تنگ پڑنے لگے۔ مجھے آتا دیکھتے تو اٹھ کر بھاگ جاتے یا پھر مل کر میرا مذاق اڑاتے اور میں بے وقوف اپنی ہی تضحیک پر ہنستی رہتی۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ سب میرے ساتھ نہیں بلکہ میرے اوپر ہنستے ہیں۔ تب میں نے ان بچوں کے پیچھے پھرنا بند کر دیا۔ ان کے کھیلوں میں شامل ہونے کے لیے منتیں کرنا بھی چھوڑ دیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ لوگ بھی مجھے بھول بھال گئے اور میں ہمیشہ سے جیسی اکیلی تھی ویسی اکیلی ہی رہی۔

میں آٹھ یا نو سال کی تھی جب مجھ پر ادراک ہوا کہ جس چیز کی کمی نے مجھے بچپن سے خوار کر رکھا ہے اسے "ماں" کہتے ہیں۔ گلی، محلے اور اسکول کے جتنے بھی بچوں کو میں جانتی تھی سب ہی کے پاس ماں تھی ایک نہیں تھی تو بس میرے ہی پاس نہیں تھی۔

اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ میری ماں حیات ہے۔ بابا نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ کیوں نہیں رہ سکتیں؟ اس کی بابا نے کبھی وضاحت نہیں کی تھی اور میرا چھوٹا سا ذہن خود سے اس معمّا کو حل کرنے سے قاصر تھا۔

بابا کی تمام محبتوں کے باوجود میرے اندر ماں سے ملنے، ماں کو دیکھنے کی طلب بڑھتی گئی۔

نو سال کی عمر میں پہلی بار میں نے بابا سے چھپ کر کوئی کام کیا اور وہ تھا ان کی الماری میں پڑی شادی کی برسوں پرانی البم کو نکال کر دیکھنا۔ جس رشتے نے بابا کو درد کے سوا کچھ نہ دیا، اس رشتے کی یادگار کو انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اکثر رات کے وقت جب بابا کو لگتا کہ میں سو چکی ہوں تو وہ الماری کا لاک کھول کر اس میں سے البم نکال کر دیکھا کرتے تھے اور اپنے رستے زخموں پر اپنی خاموش محبت کا لیپ لگا کر ان کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔ امی کے لیے یہ بندھن مجبوری کا تھا مگر بابا نے صدق دل سے اس رشتے کو نبھایا تھا اور رشتہ ختم ہو جانے کے اتنے سال بعد تک امی کی یاد دل میں بسائے اس بندھن کا حق ادا کرتے چلے آ رہے تھے۔

اگلے دو سالوں میں ہم دونوں نے اس البم کو ان گنت بار دیکھا مگر کبھی ایک ساتھ نہیں۔ بابا نے اپنی دانست میں مجھ سے چھپ کر اور میں نے ان سے خفیہ۔ اپنی ماں کی تصویروں کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوتی تھی یہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

ان کے ہونٹوں کا کٹاؤ، رخساروں کا ابھار، بھوؤں کی کمان سی اٹھان۔ جس جیتی جاگتی ماں کا ایک نقش بھی مجھے یاد نہیں تھا اس کے تصویروں میں ابھرے نقوش پر ہاتھ پھیر پھیر کر میں نے انہیں ازبر کیا۔ بلاشبہ میری ماں ایک خوب صورت عورت تھی اور دلہن کے روپ میں سج کر ان کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی جب بابا کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ نجانے دوسری طرف سے بابا کو کیا کہا جا رہا تھا۔ میں لحاف میں دبکی ان کی ہوں، ہاں سنتی رہی۔

"کس کا فون تھا بابا؟" تجسس نے مجھے چپ نہیں رہنے دیا۔

"تم جاگ رہی ہو اب تک؟" مجھے جاگتا پا کر وہ چونکے۔

"فون کس کا تھا بابا؟" پتا نہیں کیوں مجھے بے چینی ہو رہی تھی ہمارے گھر فون ویسے ہی کم آتے تھے کجا اتنی رات گئے؟ بابا کچھ دیر خاموش رہے۔

"آپ کی نانی اماں کا انتقال ہو گیا ہے بیٹا۔" آخر کار انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

شاید انہیں لگتا تھا کہ نانی کے انتقال کا سن کر مجھے دکھ پہنچے گا مگر مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔

نانی کے حوالے سے بہت دھندلی سی چند یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں اور ان میں سے کوئی بھی اتنی خوشگوار نہ تھی جو مجھے ان کی موت پر پُرملال کر سکتی۔

بہت پہلے جب میں چھوٹی تھی تب بابا مجھے کبھی کبھار نانی سے ملوانے ان کی حویلی لے جایا کرتے

الجھن عود کر آئی۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھیں۔

"امی! میں ہوں جویریہ۔" میں نے اپنے بے قابو ہوتے جذبات پر بمشکل بند باندھتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں میں وہاں کھڑی کیسے تھی؟ میرا روم روم مجھے آگے بڑھ کر اس عورت سے لپٹ جانے کو کہہ رہا تھا جو میری ماں تھی' کوئی انجانی قوت مجھے ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔

"تم!" ان کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ ناگواری اور پھر غصہ نے لے لی "تم یہاں کیسے آگئیں۔ ہم نے ندیم کو منع بھی کیا تھا کہ...... سمجھ گئی وہ تمہیں جان بوجھ کر یہاں لایا ہے تاکہ تماشا کھڑا ہو سکے۔ کم ظرف انسان آخر دکھادی نہ اپنی اصلیت۔"

امی یک دم بھڑک اٹھیں اور میں بھونچکی رہ گئی۔

بابا کو تو علم بھی نہیں تھا کہ میں یہاں آئی ہوں اور سارا الزام ان کے سر آرہا تھا۔

"اب یہاں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں دیکھ لے' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" امی کی زبان نے زہر اگلا۔ یہ وہ الفاظ نہیں تھے نہ ہی یہ وہ ردعمل تھا جو میں نے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان ہونے والی پہلی ملاقات کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔

"امی! میں تو......" میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

"یہ لڑکی آپ کو امی کیوں کہہ رہی ہے؟" میری بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے کاٹ کر یہ چبھتا ہوا سوال پوچھا گیا۔

میں نے اور امی نے چونک کر سوال پوچھنے والے کو دیکھا۔

وہ سات آٹھ سال کا لڑکا تھا جو امی کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ امی کی طرح اب وہ بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"بتائیں نا ماما! یہ لڑکی آپ کو امی کیوں کہہ رہی ہے؟"

"ماما۔" میرا سویا ہوا ذہن ایک جھٹکے سے بیدار ہوا۔

میری امی صرف میری امی نہیں بلکہ اس بچے کی بھی ماں تھیں۔

"وہ اس لیے کیونکہ یہ لڑکی تمہاری امی کی بیٹی ہے' یعنی تمہاری سوتیلی بہن۔"

پوچھے گئے سوال کا جواب دینے والے میرے ماموں کے دو بیٹے تھے جو نجانے کب میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

بچپن میں اسی صحن میں پیڑھی پر بیٹھے ہوئے میری ان دونوں کے ہاتھوں اچھی درگت بنا کرتی تھی۔ کبھی گیند کھینچ کر مارتے تو کبھی مٹی کے گولے بنا کر ایسا تاک کر نشانہ لیتے کہ میرے سارے کپڑے داغ دار ہو جاتے۔ یہ بڑے ماموں کے سپوت تھے یا چھوٹے کے' یہ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ تمہاری اماں کی پہلی شادی ہمارے گھر کے ایک نوکر کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ اسی کی بیٹی ہے۔" ان میں سے ایک نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے قد بے شک لمبے ہو چکے تھے مگر دوسروں کو اذیت دے کر مزا لینے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"اوے یار! اس طرح تو ہمارا اصغر علی ایک نوکرانی کا بھائی ہوا نا۔" ان میں سے ایک نے دوسرے کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے چونکنے کی اداکاری کی۔

"بکواس بند کرو۔" اپنی اور ان کی عمروں کے فرق کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے اصغر علی نے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ کہا۔

"ہم بکواس نہیں کر رہے۔ یقین نہیں آتا تو اپنی اماں سے پوچھ لو کہ یہ نوکرانی تمہاری کیا لگتی ہے۔" وہ دونوں خود پر ازحد معصومیت طاری کرتے ہوئے بولے۔

اصغر علی نے پلٹ کر امی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

پھر کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

اس کے بعد اس سوا چار فٹ کے فتنے نے وہ فساد مچایا کہ الاماں۔

اس کو اس بات سے دھچکا نہیں لگا تھا کہ اس کی ایک عدد سوتیلی بہن بھی ہے۔ جس کے وجود سے وہ اب تک لاعلم تھا بلکہ اس کی شاہانہ طبیعت اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری تھی کہ اتنی کم حیثیت لڑکی کے ساتھ اس کا اتنا قریبی رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔

میرے دونوں ماموں زادوں نے ہمیشہ کی طرح تاک کر نشانہ لگایا تھا' اصغر علی کسی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ امی اسے چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔ صرف امی ہی نہیں بھانت بھانت کے لوگ اصغر علی کے گرد جمع ہو گئے اور وہ دونوں فساد کی جڑ جنہوں نے یہ ساری آگ بھڑکائی تھی' کب کے منظر سے غائب ہو چکے تھے۔

مجھ میں ذرا بھی عقل ہوتی تو میں بھی وہاں سے رفو چکر ہو جاتی پر مجھ میں عقل ہوتی تو میں وہاں جاتی ہی کیوں۔

معاملے کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں نے ایک کالی شلوار قمیص میں ملبوس' سر سے پیر تک جاگیر دارانہ کروفر میں لپٹے سانڈ نما آدمی کو تیز قدموں سے صحن پار کر کے اس مجمع کی طرف آتے دیکھا۔ آدھی بھیڑ تو اس آدمی کو آتا دیکھ کر ہی چھٹ گئی جو باقی رہ گئے ان کا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حساب ہو گیا اور ان رہ جانے والے باقی لوگوں میں امی بھی شامل تھیں۔

میں سمجھ گئی کہ یہ وہی کوئی ہیں جن کے مجھے دیکھ لینے سے امی ڈر رہی تھیں۔ ساتھ ہی یہ عقدہ بھی مجھ پر وہیں کھڑے کھڑے کھلا کہ امی آج سے پہلے مجھے اور بابا کو نانی کے گھر میں کبھی کیوں نہیں نظر آئیں۔

بابا سے خلع لینے کے ایک سال کے اندر امی کی دوسری شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے نئے شوہر کی سنگت میں ایک بار پھر دلہن بن کر اس دہلیز کو پار کر گئی تھیں۔ لیکن امی کی پہلی اور دوسری شادی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سب سے بڑا اور نمایاں فرق تو یہ تھا کہ ان کی دوسری شادی اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی قائم تھی۔

کیسے قائم تھی؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا؟

میں حیرت کے عالم میں منہ سے کف اڑاتے' مغلظات بکتے اس مرد کو دیکھ رہی تھی جو میری امی کا دوسرا شوہر تھا۔

میری وہی ماں جس نے اپنی تنک مزاجی سے بابا کو تین سال تگنی کا ناچ نچائے رکھا' اس آدمی کی منتیں کر رہی تھی۔ اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

یہ تھا امی کی پسند کا معیار؟

یہ تھا وہ آئیڈیل جس کی خاطر امی نے میرے نفیس اور مہذب باپ کو ٹھکرا دیا؟

پر شاید اس میں امی کی پسند کا اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ عورت جو ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہو' کی پسند و ناپسند کو آخر اہمیت ہی کتنی دی جاتی ہے؟ انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو امی کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی۔

نادانستگی میں ہی سہی' بابا اور میرے وجود نے ان کے خوابوں کو ناقابل حصول بنا دیا تھا۔

میرے سامنے کھڑا آدمی تہذیب' اخلاق اور شرافت میں بھلے میرے بابا کے پاسنگ نہ ہو مگر ایک چیز میں وہ ان پر ضرور فوقیت رکھتا تھا۔

اور وہ چیز تھی پیسہ۔

بے شمار' بے حساب پیسہ جو اس شخص کی ملکیت تھا۔

ان سب لوگوں کی نظر میں صرف پیسے کی ہی اہمیت تھی۔ اسی پیسے کی وجہ سے میرے بابا جیسے شریف النفس شخص کو پیر کی جوتی کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس شخص کو بدمزاج اور بدزبان ہونے کے باوجود سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔

پر یہ سارا اشتعال' سارا غصہ آخر تھا کس پر؟ مجھے تو ابھی تک یہی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس سارے ہنگامے میں وہ سب جیسے مجھے بھول ہی گئے تھے۔ میں ایک طرف کھڑی یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ آخر ایک بیٹی کا اچانک اپنی ماں سے ملنے آجانا اتنی بڑی بات تو نہیں کہ اس پر اس طرح تماشا

لگایا جائے۔

تب مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ شخص صرف بدزبان اور بدلحاظ ہی نہیں بلکہ شکی اور تنگ نظر بھی ہے۔ حالانکہ امی خود اس کی تیسری بیوی کے عہدے پر فائز ہوئی تھیں پھر بھی اس نے کبھی امی کو ان کی پہلی شادی جیسی سنگین غلطی کو بھولنے نہ دیا۔

پچھلے نو سال میری ماں نے اس آدمی کو یہ یقین دلاتے گزارے تھے کہ ان کا اپنے سابقہ شوہر سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں' پر وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا اور آج تو اسے میری شکل میں جیتا جاگتا ثبوت بھی مل گیا تھا۔

"اگر بیٹی اس طرح ملنے آسکتی ہے تو پرانے شوہر سے بھی یقیناً "ملاقاتیں ہوتی ہوں گی۔"

وہ بول رہا تھا اور امی اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھیں جنہیں وہ سننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر یہ شور شرابا جاری رہا۔ آخر گھر کے چند بزرگ بیچ میں آئے اور اس کو بکتا جھکتا وہاں سے لے کر چلے گئے۔

امی تخت پر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کیونکہ میرے سامنے میری ماں میری حماقت کی وجہ سے اپنے شوہر کے ہاتھوں بے عزت ہوئی تھی۔

"امی جی۔" میں نے آگے بڑھ کر انہیں تسلی دینی چاہی۔

میری آواز سن کر وہ یوں اچھلیں جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"تم ابھی تک یہیں ہو۔" وہ غصے کے مارے کانپنے لگیں۔ "یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تمہاری اور تمہارے باپ کی ملی بھگت ہے مجھے سب کے سامنے ذلیل کروانے کی۔ میرا بسا بسایا گھر اجاڑنے کی۔ ابا نے تمہارے باپ کو اوقات سے بڑھ کر نواز دیا تھا' پر چھوٹے برتن میں زیادہ ڈال دینے سے برتن بڑا نہیں ہو جاتا' الٹا چھلکنے لگتا ہے۔ تمہارے باپ سے بھی اتنی عزت سنبھالی نہیں گئی۔ ہماری برابری کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن چھوٹے لوگ ہمیشہ چھوٹے ہی رہتے ہیں۔" امی تنفر بھرے لہجے میں جانے کیا کیا بول رہی تھیں۔

"امی! میں تو......" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔

"خاموش۔" ان کا لہراتا ہوا ہاتھ میرے گال پر پڑا اور انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ اس کے بعد کچھ بھی کہنے کی خواہش میرے اندر ہی دم توڑ گئی۔ میں گال پر ہاتھ رکھے پتھرائی آنکھوں سے امی کو دیکھنے لگی۔

میرے تخیل نے مجھے بتایا تھا کہ جب ماں مجھے پہلی بار چھوئے گی تو کائنات کے سارے رنگ میرے اردگرد بکھیر دے گی۔ لیکن اس ایک تھپڑ نے میری خوش فہمی کا شیش محل کرچی کرچی کر ڈالا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ میرا یہ شیش محل تو بنا ہی برف کا ہوا تھا جس میں کسی کی محبت کی گرماہٹ شامل نہیں تھی۔ ذرا سی نفرتوں کی آنچ کیا لگی' پگھل کر پانی بن گیا۔ اب یہی پانی میری آنکھوں سے بہہ کر میرے چہرے کو بھگو رہا تھا۔

صحن میں اور بھی لوگ موجود تھے لیکن میں اکیلی کھڑی تھی۔ بالکل اس نکیل ڈلے کرتب دکھانے والے جانور کی طرح جس کے گرد تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے مگر وہ خود ان کے بیچ تنہا رہتا ہے۔

ایک بارہ سال کی بچی کا حوصلہ ہی کتنا ہوتا ہے اور جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا' وہ میرے حوصلے کی تاب سے بڑھ کر تھا۔

"جویریہ!" عین ممکن تھا کہ میں سب کے بیچ وہیں چکرا کر گر پڑتی کہ اچانک ایک مانوس آواز نے میرا نام پکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بابا صحن میں داخل ہو رہے تھے۔ میری بے جان ہوتی ٹانگوں میں پھر سے جان آ گئی۔

"بابا" میں دوڑتی ہوئی جا کر ان سے لپٹ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" بابا سخت حیرت زدہ تھے۔

"اب اتنے بھولے مت بنو۔ پہلے خود اسے یہاں بھیجا جھگڑا ڈلوانے کے لیے اور اب انجان بن رہے ہو۔" یہ امی کی زہر میں ڈوبی آواز تھی۔

اس کے بعد اگلے بیس منٹ میں کیا ہوا' یہ بتانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ امی اور ان کے گھر والوں نے جی بھر کے بابا کو ذلیل و خوار کیا۔ جس طرح امی کے دوسرے شوہر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ امی کا بابا سے کوئی رابطہ کوئی تعلق نہیں' اسی طرح وہاں موجود نفوس میں سے کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو راضی نہ تھا کہ میرے یہاں آنے کے پیچھے بابا کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم نہیں ہے۔

سچ ہے کہ بدگمانی لاعلاج ہوتی ہے۔

ان لوگوں نے خاص طور پر فون کر کے بابا کو آفس سے یہاں بلوایا تھا اور یہ سن کر کہ میں یہاں موجود ہوں' وہ بے چارے دوڑے چلے آئے اور اب سب کے بیچ کھڑے ہو کر خود پر لگنے والے الزامات سن رہے تھے۔

مجھے آج تک وہ ذلت بھرے لمحات نہیں بھولتے۔ ایک طرف ان لوگوں کی حقارت بھری نظریں اور زہر میں بجھی زبانیں اور دوسری طرف مجھے اپنے ساتھ مضبوطی سے لپٹائے کھڑے بابا۔

وہاں کھڑے ہوئے میرے دل و دماغ نے اس حقیقت کو بھی قبول کر لیا جو شاید عام حالات میں کبھی نہ کرتا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ میں اور بابا کامیابی کی کتنی منزلیں کیوں نہ طے کر لیں۔ ان مغرور لوگوں کی نظر میں کمتر ہی رہیں گے کیونکہ یہ لوگ انسانوں کو کسی اور ہی نظریے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو سکتی ہے مگر ان لوگوں کے سوچنے کا انداز نہیں بدل سکتا۔

اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے میرے دل کے ٹکڑے ہو گئے کہ ان سطحی لوگوں کی فہرست میں میری ماں' میری اپنی ماں بھی شامل ہے۔ دنیا کی کسی مجبوری نے اس کے پیر نہیں باندھ رکھے تھے۔ وہ اگر ہم سے دور تھیں تو اپنی سوچ اور اپنی تنگ نظری کی بدولت۔ باقی تمام لوگوں کی طرح اپنی سوچ کو بدلنا ان کے بھی بس سے باہر تھا۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ جو سچائی مجھے آدھے پونے گھنٹے میں نظر آگئی' وہ نانا پر اتنے سالوں میں کیسے نہ واضح ہو سکی تھی۔ کیا وہ اپنے گھر والوں کی ذہنیت اور فطرت سے واقف نہ تھے؟ کیا سوچ کر انہوں نے امی اور بابا کو اس بے جوڑ رشتے میں جوڑا تھا؟

اس دن بڑے لوگوں کی اس بڑی سی حویلی میں جہاں سے سینکڑوں غربا خیرات و زکواۃ سے اپنی جھولیاں بھرے نکلتے تھے ہم دونوں باپ بیٹی نے بھی اپنی بساط سے بڑھ کر ذلت سمیٹی۔

پھر ہم نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا جس سے ہماری اتنی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بابا نے اپنا ٹرانسفر دوسرے شہر کروا لیا۔ امی سے ملنا تو دور کی بات' ان کو دیکھنے کی بھی اب کوئی خواہش میرے اندر باقی نہیں رہی۔" جویریہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اسٹیئرنگ پر رکھے حذیفہ کے ہاتھ ساکت تھے۔ گاڑی سے باہر پھیلے اندھیرے کی طرح ساکت جس میں نہ کسی چیز کی آہٹ سنائی دے رہی تھی نہ کوئی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے حذیفہ کو لگا جیسے وقت بھی ٹھہر گیا ہو بس گاڑی کے اندر لگی ڈیجیٹل گھڑی کے پل پل بدلتے چمک دار ہندسے وقت کے آگے بڑھنے کی نشاندہی کر رہے تھے۔

آج اماوس کی رات تھی۔ تاریک رات کی سیاہی میں اپنے اجالے سے روشنی کرنے والا چاند آج آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم تھا۔ اپنے اپنے مدار میں سورج بن کر جگمگانے والے ان گنت ستارے اس دور افتادہ دنیا میں پھیلی تاریکی کو کم کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر فلک پر شرمندگی سے ٹمٹما رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہے کہ میرے رویے سے سب کو بہت مایوسی ہوئی ہے۔ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ لیکن میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا' اتنے عرصے کے بعد امی کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں اسٹیج پر نہیں بلکہ اس صحن میں قدم رکھنے جا رہی ہوں جہاں بارہ برس کی عمر میں کھڑی ہوئی تھی۔

سب کے بیچ۔ سب کی نفرت بھری نگاہوں کا مرکز بن کر۔"

اندھیرے میں حذیفہ کو اس کے چہرے کے خدوخال نظر نہیں آرہے تھے لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

حذیفہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"جویریہ! میں مانتا ہوں کہ ماضی میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا' وہ ناقابل برداشت تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے ماضی کو اپنے حال پر اثر انداز ہونے کی اجازت دے دو۔ اگر آج تم اسٹیج پر چلی بھی جاتیں تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں اتنے سالوں کے بعد تمہیں پہچانتی ہی نہیں اور اگر پہچان بھی لیتی تو کیا کر لیتی؟ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا اسے بدلا نہیں جا سکتا لیکن جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے' اسے بہتر بنانے کی کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔ اپنے ماضی سے ڈرنا چھوڑ کر اپنے حال میں جیو بنا کسی ڈر کے کیونکہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ اسے ایک خوف کی نذر کر دیا جائے۔"

اتنا تو وہ جانتا تھا کہ دل میں بیٹھا برسوں پرانے خوف کا اثر محض اس کے ایک بار سمجھا دینے سے زائل ہونے والا نہیں۔ اسے ختم کرنے کی کوشش تو جویریہ کو خود ہی کرنا تھا مگر اس وقت اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بچوں کی طرح آنسو بہاتی وہ کوئی بھی کوشش کرنے کے قابل نہیں لگ رہی تھی۔

جواب بارہ سال کی دکھ رہی تھی۔ وہ بارہ سال کی عمر میں کیسی لگتی ہوگی۔ حذیفہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

حذیفہ کے چہرے پر بہت ناقابل فہم سے تاثرات تھے۔ جویریہ اگر دیکھ لیتی تو ضرور حیران ہو جاتی۔

"تمہارا ہاسٹل آگیا ہے۔" حذیفہ نے اپنا چہرہ واپس ونڈ اسکرین کی طرف موڑتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جویریہ نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ تھوڑی دیر قبل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے والے درخت اب اپنی جگہ پر کھڑے تھے

وہ آہستہ سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

حذیفہ کچھ دیر اندھیرے میں جویریہ کے جاتے قدموں کی چاپ سنتا رہا پھر یہ چاپ بھی اس سناٹے میں گم ہو گئی جو جاڑے کی راتوں کا خاصا ہوتا ہے۔

اس سارے قصے کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔

جویریہ کی معمّا جیسی شخصیت کے کئی گمشدہ حصے حذیفہ کے ہاتھ لگ گئے۔ اس کا بات بات پر گھبرانا' لوگوں سے زیادہ گھلنے ملنے سے گریز کرنا جیسے معمے بھی خود بخود حل ہوتے چلے گئے۔ اس کی شخصیت کا ادھورا پن اور اعتماد کی کمی کے پیچھے اس کی ماں کی بے اعتنائی اور نفرت تھی۔ اپنی ہی سگی ماں کے ہاتھوں دھتکارا جانا اس کی زندگی کا ایک ایسا ناسور تھا جس کی اذیت اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تھی۔

"یاد رکھو' ماں صرف ماں کبھی نہیں ہوتی۔ ماں وہ ڈھال ہے جو دنیا کے سرد و گرم سے انسان کو بچاتی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو وقت کی کسوٹی پر سب سے کھرا اور مضبوط ثابت ہوتا ہے اور جس شخص کا بدقسمتی سے یہی رشتہ ناپائیدار ہو' اس کی دلی اور ذہنی کیفیت کو تم نہیں سمجھ سکتے۔"

محب نے کافی پھینٹتے ہوئے حذیفہ سے کہا جب حذیفہ نے ساری کہانی اس کے گوش گزار کی۔

محب اور حذیفہ اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ آگے چل کر حذیفہ نے بزنس اسٹڈیز کو اپنایا اور محب نے نفسیات کے شعبے کا انتخاب کیا۔ اسے اس پروفیشن میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پر وہ ابھی سے ممتاز ماہرین نفسیات میں شمار ہونے لگا تھا۔

"لیکن اپنے والد کے ساتھ اس کے تعلقات بالکل نارمل ہیں ان سے اسے ہمیشہ بھرپور توجہ اور پیار ملا ہے۔" حذیفہ بولا۔

"تب ہی تو وہ آج تک اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہے ورنہ زندگی کی دوڑ میں کب کی تیورا کر گر چکی ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کو یہ خوف بھی ضرور ہوگا کہ یہ ایک واحد رشتہ جس پر وہ ساری زندگی انحصار کرتی آئی ہے اگر اس سے چھن گیا تو کیا ہوگا؟"

"ویسے یہ لڑکی ہے کون جس کی آپ بیتی اتنی دیر سے زیر بحث ہے۔" محب نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا۔ دوست ہے میری۔"

"صرف دوست؟"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟" حذیفہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے کبھی صرف کسی دوست کے لیے تمہارے چہرے پر تشویش کی اتنی گہری لکیریں نہیں دیکھیں۔"

محب انتہائی زیرک انسان تھا۔ محض ایک سرا پکڑ کر پوری داستان زنبیل میں سے کھینچ کر نکال لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی لیے تو اس فیلڈ میں اتنی جلدی اپنا مقام بنا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ۔

"نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔" حذیفہ کی خاموشی پر وہ کافی کا خالی مگ سامنے ٹیبل پر رکھتا ہوا بولا۔ "لیکن اس لڑکی کو یہ ضرور بتا دینا کہ وہ بہت خوش قسمت ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس کے پاس تمہارے جیسا دوست موجود ہے۔" محب نے مسکرا کر کہا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے کافی حد تک خود کو یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا اور سب بھول بھال کر پڑھائی میں جُت گئی تھی۔

حذیفہ جب لائبریری میں داخل ہوا تب وہ ایک کتاب ہاتھ میں پکڑے دوسری کی تلاش میں ایک شیلف میں ترتیب سے سجی کتابوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"ہیلو۔" وہ اسے دیکھ کر اس کے قریب آگیا۔

جویریہ کی کتابوں پر پھرتی ہوئی انگلی ایک دم رک گئی۔ لائبریری کے پرسکون اور خاموش ماحول میں جویریہ کے گالوں پر یکدم پھیلنے والی سرخی حذیفہ کو واضح طور پر نظر آئی۔

جویریہ نے اپنا ہاتھ شیلف سے پیچھے کر لیا۔

کتاب ڈھونڈنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ساری کتابوں پر لکھے نام اور ان کی شناختی علامات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔

اس ایک رات کے گزر جانے کے بعد صبح کے اجالے نے گمشدہ حواسوں کے علاوہ جویریہ کو جو کچھ لوٹایا تھا' اس میں سرفہرست شرمندگی کا وہ احساس تھا جو ماضی کی کتاب ایک ایسے شخص کے سامنے کھول دینے سے پیدا ہوا تھا جسے وہ چند ماہ قبل جانتی تک نہ تھی۔

حذیفہ کا یہ آخری سمسٹر چل رہا تھا اس کی پڑھائی سے منسلک مصروفیات ان دنوں عروج پر تھیں۔ پر اس وقت کتابوں سے بھری لائبریری کے بیچ کھڑے حذیفہ کو اچانک شک سا ہوا کہ ایک ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہوئے' ایک ہی راستوں پر آتے جاتے ہوئے بھی جویریہ سے اتنے دنوں آمنا سامنا نہ ہونے کا سبب اس کی خود کی مصروفیات کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

اگر جویریہ کا خیال تھا کہ وہ باقی ماندہ سمسٹر حذیفہ سے کترا کر گزار سکتی ہے تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ کم از کم حذیفہ کا چھپن چھپائی کے اس حماقت انگیز کھیل میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"کل تمہارے بابا کو Cardiac centre میں دیکھا تھا۔ میں اور میرے ڈیڈ اپنے ایک آفس ورکر کی عیادت کے لیے گئے تھے جو وہاں پر ایڈمٹ ہیں۔ وہیں تمہارے بابا سے بھی ملاقات ہو گئی۔"

حذیفہ نے ایک شیلف کے ساتھ کندھا ٹیکتے ہوئے اتنے عام اور نارمل لہجے میں کہا جیسے وہ شام ان کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہ ہو' جیسے معمول کی گفتگو سے ہٹ کر کوئی بات ان کے درمیان کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔

جویریہ کو اس کی موجودگی سے نہ سہی پر اس کے

انداز سے ضرور تسلی ہوئی۔

"یہ ہارٹ کا مسئلہ تمہارے بابا کو کب سے ہے؟" حذیفہ نے جویریہ سے پوچھا۔

"دو سال پہلے پتا چلا تھا۔" اس نے بتایا۔

"علاج یہاں لاہور میں کروا رہے ہیں؟"

"نہیں وہیں راہوالی میں ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرانے کے لیے لاہور آنا پڑتا ہے۔" جویریہ نے آہستہ سے کہا۔

لائبریری کی چار دیواری میں ہونے والی گفتگو خود بخود سرگوشیوں کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی۔ لیکن جویریہ کی دھیمی آواز کا سبب صرف اس کی لائبریری میں موجودگی نہیں تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ جس طبقے کی حذیفہ نمائندگی کرتا تھا وہاں لڑکے اور لڑکیوں دوستی یا بات چیت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر جس ماحول کی جویریہ پیداوار تھی وہاں لڑکیوں کو اس قسم کی کسی بھی سچویشن کو بنا گھبرائے ہینڈل کر لینے کے لیے بالکل تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

جویریہ کا خیال تھا کہ اتنا عرصہ یہاں گزار لینے کے بعد اس نے صنف مخالف سے گفتگو کے دوران اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا سیکھ لیا ہے لیکن اس کا یہ خیال حذیفہ کے سامنے آجانے پر ہمیشہ غلط ثابت ہو جاتا تھا۔

"پلیز..... میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔" جویریہ نے ہاتھوں میں پکڑی کتاب کی جلد پر مضبوطی سے انگلیاں گاڑتے ہوئے سامنے کھڑے حذیفہ سے کہا۔

حذیفہ نے ایک نظر اس چھوٹی سی لڑکی پر ڈالی جو اپنی جان ناتواں پر مصائب کے کتنے بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی پھر خفیف سے جھٹکے سے اپنے کندھے کو شیلف سے جدا کیا اور اس کا راستہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا آپ نے پھر لندن کا پروگرام بنا لیا؟" اسمارہ نے دانش سے کہا جو اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں کام سے نہیں بلکہ تفریح کرنے جا رہا ہوں۔" دانش نے اپنی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر اسمارہ کی طرف دیکھا۔

"مت کیا کیجئے اتنا زیادہ کام۔ انسان کو کچھ وقت اپنے لیے بھی نکالنا چاہیے۔"

"بس ایک بار حذیفہ کے قدم جم جانے دیجئے آپ کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔ پھر ہمارا بیٹا کام کرے گا اور ہم دونوں میاں بیوی آرام کریں گے بلکہ ایک وقت وہ ہو گا جب آپ تنگ آکر کہیں گی کہ خدا کے لیے دانش ہر وقت سر پر مت سوار رہا کیجئے۔ جائیے کچھ کام وام کر کے خود کو مصروف رکھیے۔"

"اس بار کتنے دن کا ٹرپ ہے آپ کا۔" اسمارہ نے موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے دانش سے پوچھا۔

"ہفتہ دس دن تو لگ ہی جائیں گے۔" دانش نے کہا تو اسمارہ کا چہرہ اتر گیا۔

"اب تو مان جائیے بیگم صاحبہ کہ آپ میرے بغیر اداس ہو جاتی ہیں۔" دانش نے اسمارہ کی شکل دیکھ کر انہیں چھیڑا۔

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بھلا اتنے آرام سے کیوں ماننے لگیں۔

"چلو! پھر یہ تو اچھا ہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں پندرہ بیس دن آرام سے گزارے جا سکتے ہیں۔"

"کیا؟" اسمارہ ان کی بات سن کر اچھل پڑیں۔

"ابھی تو آپ نے ہفتہ دس دن کا کہا تھا۔ یہ پھیل کر پندرہ بیس دن کیسے ہو گئے۔"

"میں تو آپ کی خاطر جلدی واپس آنے کو کوشش کر رہا تھا پر اگر آپ کو کوئی مسئلہ نہیں تو میں تسلی سے اپنا کام مکمل کر لوں گا۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے بولے تو اسمارہ انہیں گھورنے لگیں۔

"دانش! آپ..... آپ بہت خراب ہیں۔" اسمارہ کو کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو یہی کہہ دیا۔

دانش قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"اسمارہ! آپ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش ہی کیوں کرتی ہیں جبکہ آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ ہمیشہ پکڑی جاتی ہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کر اسمارہ کے برابر صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔

"آپ میرے ساتھ لندن کیوں نہیں چلتیں؟" انہوں نے صوفے کی پشت پر بازو رکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟" اسمارہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آپ اکیلی یہاں رہ کر کیا کریں گی؟ حذیفہ بھی دو چار دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ نکل جائے گا۔" انہوں نے الٹا اسمارہ سے سوال کیا۔

"مگر ایسے اچانک۔" وہ آدھی قائل ہو گئیں۔

"آپ ارادہ باندھیے۔ باقی سب انتظامات ہو جائیں گے۔" دانش نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟ کروں عبدالرحمٰن کو فون؟"

دانش نے اپنے ٹریول ایجنٹ کا نام لیا جو ان کے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ لیکن اسمارہ کا جواب سننے سے قبل ہی وہ ان کے چہرے پر آمادگی کے آثار دیکھ کر فون کی جانب ہاتھ بڑھا چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

عرشی نے تنگ آکر ٹی وی کا ریموٹ پرے پھینکا۔ دیکھنے لائق ایک بھی پروگرام نشر نہیں ہو رہا تھا۔

"جتنے زیادہ چینل اتنے ہی بوگس پروگرام۔" اس نے بھنا کر سوچا۔ صبح سے اسے یوں بھی ہر بات پر غصہ آ رہا تھا۔ (اب دیکھنے والے کا موڈ ہی خراب ہو تو پروگراموں کا کیا قصور)

عرشی اپنے بستر پر اوندھی ہو کر لیٹ گئی۔ وہ سخت بوریت کا شکار تھی۔ عام طور پر اس کے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے بے کار مشاغل ہوتے تھے جیسے فون پر دوستوں سے لمبی لمبی گفتگو کرنا، اونچی آواز میں میوزک سننا وغیرہ پر اس وقت کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور یہ سب حذیفہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

پچھلے کئی مہینوں سے اس نے اپنے آخری سمسٹر کو ہوّا بنا کر خود کو مصروف رکھا ہوا تھا۔ اگر کچھ وقت پڑھائی سے بچتا تو اس میں وہ دانش کے ساتھ آفس چلا جاتا۔ عرشی بے چاری کے حصے میں کچھ بھی نہیں آتا پھر بھی عرشی نے اپنی طبیعت کے خلاف بہت صبر سے کام لیا، یہ سوچ کر کہ کبھی نہ کبھی تو حذیفہ کی ان مصروفیات میں کمی واقع ہو ہی جائے گی۔ پر اتنے مہینوں کے صبر کا پھل اسے کیا ملا؟ امتحان ختم ہوتے ہی حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیر کو چلا گیا اور عرشی پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو عرشی اپنی گاڑی ہی نکال کر گھوم پھر آتی پر اس وقت گاڑی گیراج میں بند تھی اور اسے وہاں بند کرنے والا بھی حذیفہ ہی تھا۔

عرشی کی مت ماری گئی تھی جو وہ ایک دن حذیفہ کو ساتھ بٹھا کر ڈرائیونگ کرنے نکل پڑی۔ سڑک پر عرشی کی ڈرائیونگ کے کرتب دیکھ کر حذیفہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے خاص طور پر تب جب سگنل بند ہو جانے کے باوجود اس کے تیزی سے گاڑی نکالنے پر ایک لنگڑا فقیر گاڑی کی زد میں آنے سے بمشکل بچا جو بتی سرخ ہو جانے کے بعد فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر بھیک مانگنے کے لیے آ رہا تھا۔

ویسے تو اس لنگڑے فقیر کو عرشی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کیونکہ عرشی ہی کی بدولت اسے اپنی ناکارہ ٹانگ کا استعمال واپس مل گیا۔ نہ ملا ہوتا تو وہ بھلا کس طرح اپنے دونوں پیروں پر اچھلتا پھلانگتا فٹ پاتھ پر واپس چڑھ کر اپنی جان بچاتا۔

حذیفہ نے جب پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر "موئی ڈرائیورن" کا بیڑا غرق ہونے کی بددعائیں دے رہا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

عہدِ وفا

ناولٹ

سونیا نوید

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی، اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لمز میں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم، بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے، حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا ہے، وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ جویریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے، اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

۲
دوسری قسط

جویریہ نے المونیم کی چھوٹی سی پتیلی میں دو کپ پانی ڈال کر اسے آگ پر رکھا اور دوسری طرف چھوٹی سی ٹرے میں ترتیب کے ساتھ کپ اور پرچ وغیرہ سجانے لگی۔

چائے کے برتن لگا کر اس نے کچن کیبنٹ میں سے بسکٹ کا ڈبہ نکال کر کھولا اور بسکٹ پلیٹ میں سجا دیے۔

چائے کے برتنوں کے ساتھ بسکٹوں کی پلیٹ کا اضافہ کر دینے کے بعد بھی جویریہ کی کچھ خاص تسلی نہیں ہوئی۔ پر مجبوری یہ تھی کہ گھر میں اس وقت کچھ اور موجود نہیں تھا اور گھر آئے مہمان کے سامنے خالی چائے لے کر جانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جب وہ گھر پر ہوا کرتی تھی تو تب گھر میں دو چار ایسی اشیا ضرور موجود ہوتی تھیں جو کسی مہمان کے اچانک آجانے پر تواضع کے لیے سامنے رکھی جا سکیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے گھر اچانک آجانے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔

جویریہ کے لاہور جانے کے بعد ندیم صاحب کھانے پینے کے معاملے میں حد سے زیادہ لاپرواہ ہو گئے تھے حالانکہ انہوں نے اسے ہاسٹل بھیجنے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا خیال رکھیں گے پر جویریہ کو نہیں لگتا تھا کہ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ جب وہ چھٹیوں میں گھر آئی تو باورچی خانے میں ہر چیز کی عدم دستیابی سے پریشان ہو گئی۔ پتی، چینی، چاول حتیٰ کہ نمک مرچ جیسی اشیا کی بوتلوں میں بھی برائے نام ذخیرہ باقی رہ گیا تھا۔

"ڈبوں کے خالی ہونے سے بڑا اس بات کا کیا ثبوت ہو گا کہ میں سب کچھ پکا تا رہا ہوں اور کھا تا رہا ہوں۔" ندیم صاحب نے جویریہ کے تفتیشی سوالوں کے جواب میں کہا۔

وہ بہت اچھا کھانا پکانا جانتے تھے۔ باورچی خانے کی ذمہ داری جویریہ نے محض چار پانچ سال قبل ہی اپنے سر لی تھی۔ اس سے پہلے ندیم صاحب خود ہی سارے کام سرانجام دیا کرتے تھے۔

"پکانے اور کھانے والے لوگ ڈبوں کو دوبارہ بھرتے ہیں۔ ایسے ہی خالی نہیں چھوڑ دیتے۔"

جویریہ خفا ہونے لگی اور وہ اس کی استحقاق بھری ڈانٹ کھا کر ہنستے رہے۔

ضرورت کی کافی چیزیں تو جویریہ پاس کی دکان سے جا کر لے آئی تھی پھر بھی کافی کچھ باقی رہ گیا تھا۔

پانی کو ابال آنے لگا۔ جویریہ نے جلدی سے اس میں پتی ڈالی۔ ندیم صاحب کسی بھی طرح کی چائے بغیر اعتراض کے پی لیا کرتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ اس وقت جو مختار چچا بیٹھے تھے چائے سمیت ہر چیز میں مین میخ نکالنے کے عادی تھے۔ چائے کا پانی پتی ڈالے بنا ذرا سا بھی زیادہ پک جاتا تو ان کو چائے کڑوی لگنے لگتی تھی۔

مختار چچا سے جویریہ وغیرہ کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی پھر بھی وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مشکل وقت میں اس مختصر سے خاندان کا بہت ساتھ دیا تھا۔

دودھ ابل کر پتیلی سے باہر آنے لگا۔ جویریہ نے جلدی سے اسے چولہے پر سے اتار کر دودھ دانی میں انڈیلا اور اسے بھی چائے والے تھرموس کے ساتھ رکھ دیا پھر ٹرے ہاتھوں میں اٹھا کر اندر کمرے کی طرف چل پڑی جہاں اس کے بابا اور مختار چچا بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پھر آپ نے کیا سوچا ندیم صاحب؟" مختار نے بستر پر تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھے ندیم صاحب سے پوچھا۔

چند ہفتوں میں ندیم صاحب کا جسم سکڑ کر آدھا رہ گیا تھا۔ کھال اور ہڈی کے درمیان گوشت کی تہہ دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ کمزوری تو پہلے ہی تھی پر اب ماس ہڈیوں پر یوں کھنچ گیا تھا کہ انسان سے زیادہ استخوانی ڈھانچہ لگنے لگے تھے۔

"یہ ناممکن ہے۔" انہوں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"دیکھیں جی۔ میں ذرا کھرا بندہ ہوں، دو ٹوک بات کرنے والا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو جتاؤں لیکن اب نوبت یہاں تک آگئی ہے تو ایسے ہی سہی۔ آپ کی حالت پچھلے کئی مہینوں سے سنورنے کے بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔ آپ کے ہسپتال کے چکروں اور ٹیسٹوں پر اٹھنے والی رقم میں نے کئی بار اپنی جیب سے خرچ کی۔"

"تم فکر مت کرو۔ تمہاری رقم لوٹائے بغیر میں مروں گا نہیں۔" ندیم صاحب نے مختار کی بات کاٹتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ سے رقم کب مانگی ہے جی۔" مختار نے ایک دم سے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم پیسوں کے بدلے جو چیز مانگ رہے ہو، وہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔" ندیم صاحب بولے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو آخر اعتراض کس بات پر ہے؟" مختار نے جھنجلا کر کہا۔

"کچھ تو خدا کا خوف کرو مختار! میں اپنی بیٹی کا ہاتھ کیسے تمہارے ہاتھ میں دے دوں اور کچھ نہیں تو اپنی اور اس کی عمر کا فرق ہی دیکھو۔" ندیم صاحب تڑپ کر بولے۔

"میری عمر کو کیا ہوا ہے۔" مختار بگڑ کر بولا۔ "بس ذرا بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے ہیں۔"

مختار نے سر کے ان حصوں پر ہاتھ پھیرا جہاں پر ابھی کچھ بال موجود تھے۔

"اور اگر عمر کا تھوڑا بہت فرق ہے بھی تو کیا ہوا۔ آپ کو اس بات سے غرض ہونی چاہیے کہ آپ کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ دیکھیں جی! آپ پچھلے کئی سال سے مجھے جانتے ہیں۔ میرا سارا کام دھندا ابھی آپ کے سامنے ہے۔ اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک کمائی ہے میری۔ آپ کی بیٹی کو پہننے اوڑھنے کی کوئی کمی نہیں ہونے دوں گا اور کیا چاہیے آپ کو۔"

"بس کرو مختار۔ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" ندیم صاحب نے تھکے لہجے میں کہا۔ ویسے بھی جویریہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی شادی کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ پڑھائی کا اچھا بہانا بنایا ہوا ہے آپ نے۔" مختار ناراضی سے بولا۔ "خوامخواہ ہی اتنی دور کالج میں پڑھنے بھجوا دیا اسے۔ لڑکی ذات ہے۔ اتنا پڑھ کر کرے گی کیا اور پھر جو حالات ہیں اس میں کیا خبر وہ اپنی پڑھائی مکمل بھی کر سکے گی یا نہیں۔" مختار نے سفاکی سے کہا تو ندیم صاحب پہلو بدل کر رہ گئے۔

"اللہ مالک ہے۔" انہوں نے امید کے ساتھ کہا۔

"اللہ تو مالک ہے ہی جی۔ پر وسیلہ تو وہ انسانوں کو ہی بناتا ہے نا اور اگر میں وسیلہ بن کر آپ کی بیٹی کو سہارا دینے کو تیار ہوں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے۔" مختار یوں بات کر رہا تھا جیسے ندیم صاحب ملک دوام کا رخت سفر باندھ کر بیٹھے ہوں۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو مختار خاموش ہو گیا۔

جویریہ نے اندر آکر ٹرے چھوٹی سی تپائی پر رکھی اور کپوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

ندیم صاحب نے جویریہ کی طرف دیکھا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بہت کم سن دکھ رہا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں کا عکس تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ جویریہ کے چہرے پر معصومیت تھی جبکہ الماس کے چہرے پر ہمیشہ رعونت نے ڈیرے ڈالے رکھے۔

اس طرح سر جھکا کر چائے بناتی ہوئی وہ اپنی عمر سے بھی کہیں کم لگ رہی تھی اور ابھی اس کی عمر بھی کیا تھی۔ فقط انیس سال اور یہ مختار کم از کم پچاس کے پیٹے میں ضرور تھا۔

جویریہ ایک ایسی ان چھوئی اور ادھ کھلی کلی کی مانند تھی جس پر ہر نیا دن نئی بہار اور نیا نکھار لے کر آرہا تھا،

وہ کیسے اپنی اس انمول متاع حیات کو مختار جیسے آدمی کے حوالے کر سکتے تھے؟

بات صرف عمروں کے فرق کی نہیں تھی۔ مختار ایک بدنیت اور موقع پرست انسان تھا جو اپنے ذرا سے فائدے کے لیے کسی کا بڑے سے بڑا نقصان کر دینے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ اس کی پہلی دو بیویاں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ سارا محلہ اس بات کا گواہ تھا کہ جب تک وہ دونوں زندہ رہیں اس شخص نے اپنے نازیبا سلوک سے ان کی زندگیاں اجیرن کیے رکھیں۔

جس رقم کو تلوار بنا کر مختار نے ندیم صاحب کے سر پر ٹانگ رکھا تھا' وہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی۔ چند ایک ضروری نوعیت کے ٹیسٹوں کے لیے فوری طور پر رقم کا بندوبست نہ کر پانے پر انہیں مختار سے مدد لینے کی ضرورت پیش آ گئی۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ان کی مجبوری جان کر مختار رقم خود ان کے ہاتھوں میں زبردستی تھما گیا تھا تب وہ اس کی اس مہربانی کے پیچھے چھپے مقصد کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مختار کی نیت خراب ہو چکی تھی۔ رقم کا صرف بہانہ تھا۔

یہ ندیم صاحب کی بدقسمتی تھی کہ وہ عمر کے اس حصے میں آکر مختار جیسے شخص کے مقروض ہو گئے۔ بس یہی ایک ذلت سہنی رہ گئی تھی۔ باقی سب مصیبتیں تو وہ جھیل ہی چکے تھے۔ اب تو یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ یہ بیماری جان کے ساتھ بچی کھچی عزت بھی کہیں سمیٹ کر نہ لے جائے۔

"اچھا ندیم صاحب' میں اب چلتا ہوں۔ شام کو پھر آؤں گا۔ آپ میری بات پر ایک بار پھر غور فرمائیے گا۔" مختار چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ندیم صاحب سیدھے ہو کر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔

پچھلے کچھ دنوں میں ندیم صاحب کی صحت بہت تیزی کے ساتھ گری تھی اور اس کی وجہ یہی پیچھا نہ چھوڑنے والی پریشانیاں اور تفکرات تھے۔

ڈاکٹر ان سے کہتے تھے کہ وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کریں پر اب وہ ڈاکٹروں کو کیسے سمجھاتے کہ وہ باپ کیسے پرسکون رہ سکتا ہے جس کی اکلوتی اولاد کا مستقبل غیر محفوظ ہو۔ جس کی زندگی میں ہی مختار جیسے بھیڑیے اس کی بیٹی پر نظر رکھ کر بیٹھے ہوں' وہ اس کے مرنے کے بعد کیا کریں گے۔ وہ چاہ کر بھی اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے تھے کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کے بعد جویریہ اس دنیا میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ جائے گی۔

وہ جانتے تھے کہ وہ ضرورت سے زیادہ منفی انداز میں سوچنے لگے ہیں پر وہ کیا کرتے۔ یہ بیماری ان کی صحت کے ساتھ ان کے مستقبل کی خوش آئند امیدوں کو بھی کھائے جا رہی تھی۔

بعض اوقات شدید مایوسی کے عالم میں ندیم صاحب کو لگتا کہ انہیں مختار کا مطالبہ مان لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ مختار جویریہ کے حق میں اچھا ہی ثابت ہو۔ لیکن شدید مایوسی کے ان لمحات میں بھی ان کی چھٹی حس انہیں خبردار کرتی تھی کہ مختار جیسے شخص کی بات مان لینا جویریہ کو کنوئیں سے نکال کر کھائی میں دھکیل دینے کے مترادف ہو گا۔

جویریہ کو تو ابھی تک اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ مختار چچا کہہ کر بلاتی ہے وہ اس کے سر کا تاج بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

ندیم صاحب نے بند آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے سر میں اٹھنے والی ٹیسوں کو دبانے کی کوشش کی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ بعض اوقات ان کے سر کا درد اتنا زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ برداشت سے باہر ہو جاتا۔

"جویریہ بیٹا! دیکھنا' دروازے پر کون آیا ہے۔" دروازے پر بجنے والی گھنٹی کی آواز نے ندیم صاحب کی پریشان کن سوچوں میں دخل اندازی کرتے ہوئے انہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

"جی اچھا۔" چائے کے خالی برتنوں کی ٹرے لے کر جاتی جویریہ نے جواب دیا۔

جویریہ کے ٹرے کچن سلیب پر رکھنے تک گھنٹی

دوبار بج چکی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے تک آئی اور اسے جھٹکے کے ساتھ کھولا۔

اور پھر حیرت سے اپنی جگہ بت بن گئی۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" حذیفہ نے مسکرا کر جویریہ سے کہا' جو ابھی تک دروازے کے بیچ حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"جویریہ! کون ہے باہر؟" اندر کمرے سے ندیم صاحب کی آواز سنائی دی۔

"انکل! میں ہوں۔ حذیفہ' لیکن آپ کی بیٹی مجھے اندر نہیں آنے دے رہی۔"

جویریہ کے بجائے حذیفہ نے اونچی آواز میں جواب دیا تو جویریہ سٹپٹا کر پیچھے ہٹی۔

"السلام علیکم انکل!"

جویریہ کی رہنمائی کا انتظار کیے بنا ہی حذیفہ ندیم صاحب کی آواز کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے کمرے تک پہنچ گیا۔

"میں نے سنا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اب کیسے ہیں آپ؟" حذیفہ نے ندیم صاحب کے بستر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ندیم صاحب بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اپنے پوچھے گئے سوال کا شاعرانہ جواب سن کر حذیفہ ہنسنے لگا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ شعر محبوباؤں کے لیے مخصوص ہے' مجھے نہیں پتا تھا کہ گھر آئے مہمانوں کی بھی اس سے تواضع کی جا سکتی ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

"مہمان کسی محبوبہ سے کم نہیں ہوتے۔ سارا دن اس انتظار میں ہی گزر جاتا ہے کہ کوئی تو آئے جس سے دو باتیں کر کے اپنا جی بہلا لیا جائے۔"

ندیم صاحب نے حسرت سے کہا تو حذیفہ کو احساس ہوا کہ بیمار شخص کی زندگی بھی کتنی محدود ہو جاتی ہے۔

ندیم صاحب کی صحت بے شک ان گزرے چند دنوں میں تیزی کے ساتھ گری تھی مگر اس نے ان کی خوش مزاجی پر فرق نہیں ڈالا تھا۔ مختار و ڑائچ جن پریشان کن سوچوں کے ساتھ انہیں تھوڑی دیر پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ حذیفہ کے آنے پر وہ انہیں وقتی طور پر پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"برخوردار! اپنی سناؤ' تم یہاں کیسے؟" انہوں نے حذیفہ سے پوچھا۔

"کچھ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ راستے میں راہوالی سے گزرا تو سوچا آپ سے ملتا جاؤں۔"

"اچھا کیا۔" ندیم صاحب نے سر ہلا کر کہا۔ "اور تمہارے باقی دوست کہاں ہیں؟"

"وہ سب اسلام آباد پہنچ چکے ہیں۔ مجھے لاہور سے نکلنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ اس لیے اب ان سب سے وہیں ملوں گا۔ اسلام آباد سے آگے' پھر ان شاءاللہ کل روانگی ہو گی۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
فصل غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل
قیمت 300 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

حذیفہ نے اپنے پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کیا۔
"جویریہ بیٹا! کچھ چائے ٹھنڈا وغیرہ تو لے کر آؤ۔"
"نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔" حذیفہ جلدی سے بولا۔
"کیوں ضرورت نہیں؟" ندیم صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔
"ٹھنڈے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا اور چائے میں زیادہ پیتا نہیں ہوں۔" حذیفہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے! پھر ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کا تو وقت بھی ہو رہا ہے۔" ندیم صاحب نے کہا۔
"ارے نہیں انکل!" حذیفہ نے منع کرنا چاہا۔
"کیوں؟ کیا کھانا بھی نہیں کھاتے ہو؟" ندیم صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تو حذیفہ ان کے انداز پر ہنس پڑا۔
"کھانا تو کھاتا ہوں۔ لیکن پلیز آپ لوگ تکلف مت کیجئے۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ میں بس اب نکلوں گا۔"
"جہاں اتنی دیر ہو چکی ہے، وہاں تھوڑی اور سہی ... اور رہی بات تکلف کی تو وہ ہم نہیں تم کر رہے ہو۔ ہم تو جو خود کھائیں گے، وہی تمہارے سامنے بھی رکھ دیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری روکھی سوکھی تمہیں پسند نہ آئے۔" ندیم صاحب نے جان بوجھ کر نفسیاتی داؤ کھیلا۔
حذیفہ ان کی چالاکی سمجھ کر مسکرانے لگا۔
"اس کے بعد غالباً" مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ شریک طعام ہونا تو میرے لیے باعث فخر ہوگا۔"
"تو پھر اب تک کہا کیوں نہیں صاحبزادے!" ندیم صاحب بھی موڈ میں آئے ہوئے تھے۔
"جاؤ بھئی جویریہ! فٹافٹ کھانے کا بندوبست کرو۔ آج حذیفہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا۔"
ندیم صاحب نے حذیفہ کو مزید احتجاج کا موقع دیے بغیر قطعی لہجے میں کہا۔
"جی بابا!"
جویریہ نے حذیفہ کی طرف دیکھا جو ندیم صاحب کے فیصلے کے آگے بے بس سا ہو گیا تھا، پھر ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔
ندیم صاحب کے لیے سوپ بنانے کے لیے جویریہ نے تھوڑی دیر پہلے ہی محلے کے ایک بچے کو پیسے دے کر چکن منگوایا تھا جو ابھی تک پلاسٹک کی تھیلی میں بند کچن کی سلیب پر پڑا تھا۔
گھر میں کھانے والے صرف جویریہ اور ندیم صاحب ہی تھے۔ ایک چکن ان دونوں کی ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا۔ اسی لیے جویریہ اسے دھو کر الگ الگ حصوں میں بانٹ کر رکھ لیتی، پھر حسب ضرورت ایک ایک حصہ نکال کر پکا لیا کرتی تھی۔
اب چونکہ حذیفہ بھی تھا اس لیے جویریہ کو چکن کے حصے، نخرے کرنا مناسب نہیں لگا۔ صرف دو بوٹیاں الگ کر کے کم مرچ اور برائے نام گھی کے ساتھ ندیم صاحب کے لیے چڑھا دیں۔ باقی چکن کے لیے وہ ٹماٹر اور ہری مرچیں کاٹ کر کڑاہی کا مسالا تیار کرنے لگی۔ جویریہ نے صبح کریلے چھیل کر رکھے تھے۔ چکن کے ساتھ دوسری ڈش کے طور پر اس نے وہی پکا لینے کا سوچا اور ان کو نمک سے مل کر دھونے لگی۔
ندیم صاحب نے کسی قسم کا تکلف نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر گھر آئے مہمان کی حسب حیثیت تواضع نہ کرنا جویریہ کے میزبانی کے اصولوں کے خلاف تھا۔
کمرے سے وقتاً" فوقتاً" ہنسی کی آواز سنائی دے جاتی۔ حذیفہ کی سنگت میں ندیم صاحب کا اچھا وقت کٹ رہا تھا۔
حذیفہ میں یہ خوبی تھی کہ وہ مقابل کو بور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کی اس خوبی کا اندازہ تو جویریہ کو ان دو ڈھائی گھنٹوں کے دوران ہی ہو گیا تھا، جو حذیفہ نے ان لوگوں کے ساتھ باغ جناح میں گزارے تھے۔
پتا نہیں حذیفہ کی زندگی میں ان دونوں باپ بیٹی کے ساتھ گزرے وقت کی کیا اہمیت تھی مگر جویریہ ایک

اکیلی دوپہر میں گزارے ہوئے وہ ڈھائی گھنٹے کبھی نہیں بھول سکتی تھی، جن کے دوران اس نے اپنے بابا کو تمام فکر و تردد بھلا کر کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس باپ کو ہنستے دیکھا تھا، جس سے وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی، مگر پیار کرنے کے باوجود انہیں وہ دینے سے قاصر تھی جو ڈھائی گھنٹوں کی قلیل سی مدت میں حذیفہ نے انہیں دیا۔
اور وہ تھی اچھی کمپنی اور دلچسپ گفتگو۔
جویریہ ایک اچھی بیٹی بن کر ندیم صاحب کا خیال رکھ سکتی تھی مگر ایک اچھی سامع، ایک اچھی دوست بن کر ان کی دلچسپیاں نہیں بانٹ سکتی تھی۔ جویریہ کو اکیلے پال پوس کر بڑا کرتے ہوئے ماں اور باپ کی دوہری ذمہ داریوں کو انہوں نے اتنی سنجیدگی سے نبھایا کہ وہ ایک مشفق اور حساس باپ تو بننے میں کامیاب ہو گئے مگر کبھی جویریہ کے دوست نہ بن سکے۔ جویریہ اور ان کے درمیان بے پناہ محبت ہونے کے باوجود ایک روایتی فاصلہ ہمیشہ برقرار رہا۔
جویریہ نے دھلے ہوئے کریلوں کے ایک طرف چیرا لگا کر انہیں اندر سے خالی کیا۔ وہ ان چیرا لگے کریلوں میں باریک کٹی پیاز، سوکھا دھنیا اور انار دانے کا نمک مرچ ملا ہوا آمیزہ احتیاط سے بھر رہی تھی، جب حذیفہ بھی کچن میں چلا آیا۔
"کھانا بس تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتا ہے۔ آپ تب تک بابا کے پاس بیٹھیے۔" اس نے حذیفہ سے کہا۔
جلدی جلدی ہاتھ چلا کر جویریہ نے تھوڑی دیر میں کافی کام نپٹا لیا تھا۔
"تمہارے بابا کے پاس کوئی ملنے والے آئے ہیں جو مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اس لیے میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔"
حذیفہ نے بتایا تو جویریہ کو ہنسی آگئی۔
"وہ مختار چچا ہیں۔ ہمارے برابر والے گھر میں رہتے ہیں۔ اکثر بابا کا حال پوچھنے آجاتے ہیں۔ آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے بھی یہاں سے ہو کر گئے تھے۔"
جویریہ نے بتایا۔
مختار کے آنے پر بیرونی دروازہ اسی نے جا کر کھولا تھا۔
مختار کے اتنی جلدی واپس آنے کی وجہ گلی میں کھڑی وہ چمکتی ہوئی گاڑی تھی، جس کو اس نے کھڑکی سے سر نکال کر اتفاقاً" ہی دیکھ لیا تھا۔
گلی میں کھیلتے بچوں سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنے پر اسے آسانی سے پتا چل گیا کہ اس گاڑی کو یہاں لے کر آنے والا اس وقت ندیم صاحب کے گھر کے اندر موجود ہے۔
انہی ندیم صاحب کے گھر کے اندر جن کے پوری دنیا میں اپنے سوا کوئی اور ہمدرد و غم گسار نہ ہونے کا یقین وہ صرف ان کو ہی نہیں خود کو بھی دلا چکا تھا۔
اس انجان شخص کی موجودگی سے متعلق جو ان گنت سوالات مختار کے ذہن میں کلبلانے لگے تھے، ان کے جوابات کے لیے وہ شام تک کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے فوراً" دوڑا چلا آیا۔
جویریہ نے چولہے پر رکھی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا۔ چکن کڑاہی کی اشتہا انگیز خوشبو بھاپ کے ساتھ نکل کر پورے کچن میں پھیل گئی۔
حذیفہ، جویریہ کے پھرتی سے چلتے ہاتھوں کو دیکھنے لگا، جو اب مسالا بھرے کریلوں پر دھاگے لپیٹ کر انہیں تلنے کی تیاری کر رہی تھی۔
"یہ کیا ہے؟"
جویریہ نے ندیم صاحب والی ہانڈی کا ڈھکن اٹھایا تو اس کے اندر نظر آنے والے بے رنگ سے سالن کی شکل دیکھ کر حذیفہ نے پوچھا۔
"یہ بابا کا پرہیزی کھانا ہے۔ الگ سے بنایا ہے۔"
جویریہ نے بتایا۔ "دراصل بابا کا دل کرتا ہے چٹ پٹی چیزیں کھانے کو لیکن وہ ان کے لیے نقصان دہ ہیں، پھر بھی وہ بہت چالاک ہیں۔ بہانے بنا کر کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے ہیں۔ آپ کو بھی کھانے پر اصرار کر کے ضرور اسی لیے روکا ہوگا تاکہ میں مہمان کا لحاظ کر کے زیادہ روک

ٹوک نہ کرسکوں، لیکن یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ آپ کی آڑ میں یہ سب کھاپی لیں گے۔"

"تم تو سچ مچ کی ہٹلر ہو۔ کھانے دیتا ناں، اگر ان کا جی چاہتا ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

"نہیں! اس میں چکنائی بہت ہے۔ بس تھوڑا سا چکھا دوں گی۔" جویریہ نے مسکراتے ہوئے اتنی رعایت کردی۔

"مسکرایا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔" حذیفہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے جویریہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا تو وہ جھینپ گئی۔

"مسالا بھرے کریلے پسند ہیں؟" جویریہ نے اپنے سرخ ہوتے گالوں پر سے حذیفہ کا دھیان ہٹانے کے لیے موضوع بدلا۔

"سب کچھ کھالیتا ہوں۔" حذیفہ نے کہا۔ وہ ابھی بھی جویریہ کو دیکھ رہا تھا۔

حذیفہ نے محسوس کیا کہ لمز کے مقابلے میں جویریہ اپنے گھر میں کہیں زیادہ پراعتماد تھی۔ اس کی گفتگو میں وہ جھجک یا ہچکچاہٹ نہیں تھی، جو عموماً وہاں پر ہوا کرتی تھی۔ شاید ایک مخلوط تعلیمی ادارے میں وہ بات چیت اور میل جول کے معاملے میں زیادہ محتاط رہا کرتی تھی۔

جویریہ نے چولہے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے حذیفہ کی طرف دیکھا جو اچانک ہی خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے ماتھے پر آئے بل بتا رہے تھے کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

جویریہ سوجی کا گرم گرم حلوہ کڑاہی سے نکال کر کانچ کی ڈش میں ڈال رہی تھی جب ندیم صاحب کے کمرے سے آتی مدھم آوازوں میں یکدم اضافہ ہوا۔ جیسے کوئی اچانک جھگڑنے لگا ہو۔

جویریہ کا رنگ فق ہوگیا۔

وہ آدھا انڈیلا حلوہ پیالے میں اور باقی آدھا کڑاہی میں چھوڑ کر اندر بھاگی۔

جس وقت وہ اور حذیفہ کمرے کے اندر داخل ہوئے، اس وقت ندیم صاحب اپنے بستر کے ایک طرف کو ڈھلکے پڑے تھے۔ ان کا چہرہ اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"بابا!" جویریہ چلا کر ان کی طرف بڑھی۔

"جویریہ! پیچھے ہٹو، انہیں سانس لینے دو۔" حذیفہ نے ندیم صاحب کا اکھڑا تنفس دیکھتے ہوئے ان سے لپٹی جویریہ کو پکڑ کر پیچھے کیا۔

ندیم صاحب کو بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ان کا جویریہ کے سر پر تسلی دینے کے لیے رکھا ہوا ہاتھ اس کے پیچھے ہٹ جانے کے باوجود ہوا میں اسی جگہ پر ابھی تک جھٹکے کھا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ندیم صاحب کے جسم کا ان کے ذہن سے رابطہ منقطع ہوگیا ہو۔

"میرا خیال ہے، ہمیں انہیں فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔ یہاں پاس میں کوئی ہسپتال ہے کیا؟" حذیفہ نے ندیم صاحب کی حالت دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

دل کے امراض کے متعلق حذیفہ کا تجربہ صفر اور معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور جویریہ کی بدحواسی دیکھ کر نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایسی حالت میں ندیم صاحب کی کوئی بھی مدد کرپائے گی۔

"یہاں قریب ہی ایک ہسپتال ہے جہاں بابا چیک اپ کے لیے جاتے ہیں مگر ٹیکسی منگوانے میں ٹائم لگے گا۔" جویریہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔ تم ساتھ چلو۔ راستہ بتاتی جانا۔" حذیفہ نے ندیم صاحب کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

ندیم صاحب کو کمرے سے باہر لے جاتے وقت لمحہ بھر کے لیے حذیفہ کی نظر دروازے کے پاس خاموش کھڑے اس کرخت صورت شخص کی طرف گئی، جسے جویریہ مختار چچا کہہ کر بلاتی تھی اور جو انہیں مشکوک نظروں سے باہر جاتا دیکھ رہا تھا، مگر ندیم صاحب کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے لٹانے اور جویریہ سے

ہسپتال کا راستہ سمجھنے کے دوران حذیفہ اسے بالکل بھول گیا۔

✿ ✿ ✿

سامنے دیوار گیر اسکرین پر چلتی سلائیڈ ایک دم سے تبدیل ہوئی تو دانش نے اپنا ہاتھ غیر ارادی طور پر آنکھوں کے آگے کرلیا۔

اب تک کے بتائے جانے والے اعداد و شمار کو ظاہر کرتی ہوئی پائی چارٹ سے سجی اس سلائیڈ کے تیز رنگ دانش کی آنکھوں میں ایک دم سے چبھے تھے۔

آج صبح سے ہی دانش کا سر بھاری تھا جو اس وقت تک ٹھیک ٹھاک قسم کے سر درد میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس درد کی وجہ سے انہیں مدھم کی ہوئی روشنی والے اس کمرے میں چلتی پریزنٹیشن پر دھیان دینے میں بھی دقت پیش آرہی تھی۔

دانش نے کوٹ کی آستین پیچھے کرتے ہوئے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، جس کے مطابق شام کے پانچ بج رہے تھے۔

دانش کے اندازے کے مطابق ابھی آدھے گھنٹے کی پریزنٹیشن اور باقی تھی۔ اس کے بعد اہم نکات پر تھوڑی سی بحث، سوال جواب، کچھ نہیں تو کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ اور درکار تھا اس میٹنگ کو برخواست ہونے میں۔

بات صرف سر درد کی نہیں تھی۔ دانش کو اس وقت اپنا پورا جسم ہی ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک تھکن سی تھی جو سارے وجود پر حاوی ہوئے جارہی تھی اور یہ تھکن آج سے نہیں پچھلے کئی دنوں سے ان کے جسم و جاں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس تھکاوٹ کا احساس تو انہیں ہیتھرو ایرپورٹ پر اترتے ہی ہوگیا تھا پر تب انہوں نے اسے سفر کی تھکن کے کھاتے میں ڈال کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

اسمارہ تو سارا راستہ سوتی ہوئی آئی تھیں۔ انہیں کبھی جہاز میں نیند ہی نہیں آئی۔ سفر کے دوران بھی اپنا کام کرتے رہے اور یہاں آنے کے بعد بھی مسلسل بھاگ دوڑ جاری رہی۔ آرام کا وقت ہی نہیں ملا۔

پر یہ بھاگ دوڑ تو وہ تیس سال کی عمر سے کررہے تھے۔ اسی طرح بنا آرام کیے، بنا رکے۔

سارا مسئلہ یہی تھا کہ اب ان کی عمر تیس سال کی نہیں رہی تھی۔

شاید اسمارہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ انہیں اب ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا۔ دانش نے گردن کے پیچھے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا، جہاں پٹھوں میں شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔

دانش نے کرسی پر پہلو بدلا تو درد کی ایک تیز لہر پورے جسم میں سے گزرتی ہوئی گئی ایک لمحے کو دانش کا جی چاہا کہ یہ میٹنگ چھوڑ کر اٹھ جائیں۔ ان کی گاڑی باہر پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ صرف دس منٹ میں وہ واپس اپنے ہوٹل پہنچ سکتے تھے۔

دانش جب بھی یہاں آتے، اپنی آمد و رفت کے لیے کیب سروس یا کرائے کی گاڑی استعمال کرتے۔ انہیں لندن میں چلنے والی زیر زمین ٹرینوں میں بھاگ دوڑ کر اترنا چڑھنا زیادہ پسند نہیں تھا۔

زیر زمین چلنے والی ٹرینوں کا ایک جال تھا جو لندن شہر میں بچھا تھا۔ یہ ٹرینیں ہر چند منٹ کے وقفے سے ہزاروں لوگوں کو اپنے شکم میں سموئے ان زمین دوز راستوں پر مستقل مزاجی سے سفر کرتی تھیں۔ لندن کا پورا شہر بیک وقت ایک سے زائد سطحوں پر آباد تھا۔ ایک زمین کے اوپر اور باقی زمین کے نیچے۔ سب سطحیں مصروف، سب انتہائی گنجان۔ حذیفہ کو زیر زمین ٹرینوں میں سفر کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

دانش نے اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ اپنی محنت سے ناممکن کو ممکن بنایا تھا، لیکن دانش کو سب سے زیادہ خوشی اور ناز خداوند کریم کے اس عطیہ پر تھا جو انہیں حذیفہ کی صورت میں ملا تھا۔

ان کے کتنے ہی دوستوں اور جاننے والوں کو یہ شکایت تھی کہ اپنی تمام عمر سود و زیاں کے حساب کتاب میں گزار دینے کے بعد جب وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سرمائے کی طرف نظر ڈالتے تو انہیں

اپنی زندگی خسارے میں نظر آتی کیونکہ ان کی اولادیں ان ماں باپ کو احترام و محبت دینے کی روادار نہیں تھیں جن کی بدولت وہ زندگی کے اس اونچے مقام پر موجود تھیں۔

پر حذیفہ ایسا نہیں تھا۔

یہ سچ تھا کہ انہوں نے حذیفہ کی تربیت میں کبھی غفلت نہیں برتی تھی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی رہنمائی کی تھی مگر حذیفہ قدرتی طور پر بھی بے حد منکسر مزاج تھا۔

نہ اس کی ذات میں اپنی حیثیت کا گھمنڈ تھا' نہ دل و دماغ میں اپنی شخصیت کا غرور اور اس کی یہی خصوصیت اسے منفرد بناتی تھی۔ اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ اپنی سرزمین سے جڑے تھے۔

کچھ عرصے پہلے تک دانش اور اسمارہ کا خیال تھا کہ حذیفہ کا یہیں کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ کروا دیا جائے۔ پر جب حذیفہ کے ایڈمشن لینے کا وقت آیا تو اسمارہ کو گردے کی تکلیف ہو گئی اور حذیفہ نے انہیں چھوڑ کر کہیں بھی جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"مام! ہمارے ملک میں بھی بہت اچھی یونیورسٹیز ہیں اور ان کی پڑھائی بھی بہت اعلا پائے کی ہے۔" اسمارہ کے اصرار کرنے پر حذیفہ نے کہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے' پر باہر کی ڈگری کی ویلیو زیادہ ہوتی ہے بیٹا۔" اسمارہ بولیں۔

"کس کی نظر میں؟" حذیفہ نے ان سے سوال کیا۔

"دنیا کی نظر میں۔"

"دنیا میرے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ میں ان کی سوچ کے مطابق اپنی زندگی گزارنے لگ پڑوں۔" حذیفہ نے کہا۔

"آپ ہی سمجھائیے اسے۔ آخر اس کے کیریئر کا سوال ہے۔" اس کے ضدی لہجے پر اسمارہ نے مدد کے لیے دانش کی طرف دیکھا۔

"کہہ تو وہ بھی غلط نہیں رہا۔" دانش نے خلاف توقع حذیفہ کی طرفداری کی۔

حذیفہ کے یہاں رہنے سے دانش کو بھی یہ تسلی رہتی کہ اسمارہ کی اچانک طبیعت خراب ہونے کی صورت میں ان کے یا حذیفہ میں سے کوئی ایک تو اسمارہ کے پاس یقیناً موجود ہوگا۔

حذیفہ ان کا دایاں ہاتھ تھا' ان کا جانشین۔

ان کے بعد اس وسیع و عریض پیمانے پر پھیلے بزنس کو سنبھالنا حذیفہ کی ذمہ داری تھی۔ اب وہ یہ کام باہر کی ڈگری لے کر کرتا یا اس کے بغیر' اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ حذیفہ کے حصے کی ذمہ داریاں اسے سونپ دی جائیں۔" دانش نے سوچا۔

انہوں نے طے کر لیا کہ پاکستان واپس جا کر پہلا کام یہی کریں گے۔ پریزنٹیشن ختم ہو چکی تھی۔ مدھم کی ہوئی روشنیاں ایک بار پھر سے تیز کر دی گئی تھیں۔

دانش کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنا دھیان ماضی سے ہٹا کر ایک بار پھر وہاں لے آئے جہاں اس پریزنٹیشن میں بتائے جانے والے نکات پر بحث شروع ہونے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اپنے ہاتھوں میں پیپر کپ سنبھالے ہوئے حذیفہ لمبی سی راہداری پار کر کے ویٹنگ روم تک آیا' جہاں جویریہ صوفے پر آڑی ترچھی ہو کر سو رہی تھی۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ کر صوفے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں اور اس کا سر صوفے کی پشت پر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔

نیند میں بھی اس کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔ حذیفہ نے ساری رات اسے اسی پریشانی کے ہاتھوں بے چین دیکھا تھا۔ تمام رات اس نے اسی ویٹنگ روم کے کونے میں جائے نماز پر نفل پڑھتے تو کبھی اسی صوفے پر بیٹھ کر انگلیوں پر درود و آیات کا ورد کرتے گزاری تھی۔

تب ہی جویریہ کی پلکوں میں جنبش کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے اپنی بند آنکھوں کو آہستہ سے کھولا شاید اسے نیند میں بھی خود پر کسی کی نگاہوں کے ارتکاز کی خبر ہو گئی تھی۔

"کینٹین ابھی کھلی ہے اور تو کچھ خاص نہیں تھا وہاں بس یہ چائے اور بسکٹ ملے ہیں۔ فی الحال انہی سے گزارا کرنا پڑے گا۔" حذیفہ نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" جویریہ نے بسکٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"یہ میں بھوک مٹانے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لے کر آیا ہوں کیونکہ تمہیں کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

حذیفہ نے دو تین قسم کے ٹکی پیک زبردستی جویریہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور اپنا چائے کا کپ لے کر جویریہ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

کھایا تو حذیفہ نے بھی کچھ نہیں تھا۔ جویریہ کو چائے اور بسکٹ دے کر اسے چکن کڑاہی' سوجی کا حلوہ اور مسالا بھرے کریلے یاد آ گئے جو حذیفہ کی ضیافت کے لیے فٹافٹ تیار کیے گئے تھے اور جن کو کھانا ان میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

جویریہ نے بسکٹ کا ذرا سا کونا کترا۔ غذا کا پہلا دانہ پیٹ میں گیا تو اسے احساس ہوا کہ اسے کتنی بھوک لگی ہوئی تھی۔

"آپ کو تو آج اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے نکلنا تھا۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جویریہ کو اچانک یاد آیا۔

بھوک مٹنے کے ساتھ وہ باقی حسیات اور سوچیں بھی لوٹ آئیں جو پریشانی کے باعث اب تک ذہن سے محو تھیں۔

"میں نے انہیں کل رات ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں نہیں آ پاؤں گا۔" حذیفہ نے بتایا۔

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"کہنا کیا تھا۔ بول بال کر چپ ہو گئے۔ فون پر اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ باقی کسر جب ملیں گے' تب جھگڑا کر کے نکالیں گے۔"

حذیفہ نے کہا پھر جویریہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"تم فکر مت کرو۔ میرے دوست ہیں۔ ان سے میں خود نبٹ لوں گا۔"

حذیفہ نے یہ کہہ کر کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور ٹانگیں سیدھی کر کے سامنے پھیلا لیں۔

وہ بھی رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور بے آرام رہا تھا۔

سفید چکنی دیواروں والے اس ویٹنگ روم میں سارے سنگل صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کرسی نما صوفے پر جویریہ نے سکڑ سمٹ کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ لیا تھا مگر حذیفہ چھ فٹ کے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ یہ بھی نہیں کر سکا تھا۔

جویریہ کو اس کا تھکا چہرہ دیکھ کر شرمندگی ہونے لگی۔ وہ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ ندیم صاحب کو مناسب طبی امداد مل جانے کے بعد وہ جانا چاہتا تو جا سکتا تھا' مگر وہ نہیں گیا۔

اس نے ایک نظر ندیم صاحب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر روتی بلکتی ہوئی جویریہ پر ڈالی..... اور پھر وہیں رک گیا۔

وہ رک گیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جویریہ ڈر رہی ہے ندیم صاحب کی طبیعت کے بگڑنے اور ہسپتال میں رات گزارنے کے خیال سے۔

اور سب سے بڑھ کر وہ ڈر رہی تھی' ایسا کچھ بھی ہو جانے کے خیال سے جسے وہ اکیلے ہینڈل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

وہ تو ذرا ذرا سی بات پر ہاتھ پیر پھلا لینے والی لڑکی تھی اور یہ تو بہت بڑے بڑے خوف تھے جو رات بھر اس کی جان کو گھیرے میں لیے رہتے۔

پھر بھلا حذیفہ ان سب کے بیچ اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔

ہسپتال کے اندر صبح کی مخصوص روٹین شروع ہو چکی تھی۔ رات دبے پاؤں چلنے والی نرسوں کی جگہ تازہ دم چست آواز والی نرسوں نے سنبھال لی تھی۔ خاکروب بالٹیاں ڈنڈے لیے فرش کو رگڑ کر صاف کرنے میں لگے تھے اور ہاتھوں میں دھلی چادروں کا ڈھیر پکڑے ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے پہلے مریضوں کے

بستر اور تکیوں کے غلاف تبدیل کرنے کے لیے آیا ئیں یہاں سے وہاں دوڑی پھر رہی تھیں۔

رات کے سناٹے کے بعد سارا ماحول جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ صبح کی روشنی میں توہمات کے وہ سائے بھی مدھم ہو گئے جو رات کے اندھیرے میں جویریہ کو اپنے چاروں طرف پھیلے نظر آ رہے تھے۔

نئی صبح، نئی امید اور نئے حوصلے کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ دوسری بہت ساری باتوں کے ساتھ جویریہ کو اب اپنے رات والے بچکانہ رویے پر بھی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"سوری! میں رات کو بہت گھبرا گئی تھی۔" اس نے اپنا رات کا رونا دھونا یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔" حذیفہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"کیا اسی لیے بابا مجھے کچھ نہیں بتاتے؟ اپنی تکلیف میرے ساتھ شیئر نہیں کرتے؟" جویریہ نے اپنی سوالیہ نظریں اچانک حذیفہ پر گاڑتے ہوئے بے چارگی سے پوچھا تو وہ سٹپٹا گیا۔

جس ماحول کو وہ ارادتاً ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ ایک بار پھر سے بوجھل ہونے لگا۔

"تمہیں خوامخواہ وہم ہو رہا ہے۔ کوئی تم سے کچھ نہیں چھپاتا۔"

"نہیں۔" جویریہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں جانتی ہوں کہ بابا مجھ سے حقیقت چھپاتے ہیں۔ جیسے میں کوئی چھوٹی بچی ہوں جو ان کی باتوں سے بہل جاؤں گی۔ جیسے مجھے بابا کے دن بہ دن گھٹتے وزن، بڑھتی کمزوری کا احساس نہیں ہو رہا۔ اگر واقعی سب کچھ ان کے کہنے کے مطابق ٹھیک ہے اور وہ بہتر محسوس کرنے لگے ہیں تو پھر یہ بہتری مجھے کیوں نظر نہیں آ رہی؟ میں نے جب بھی ڈاکٹروں سے اس بارے میں سوال کیا، مجھے نئی دریافت ہونے والی ادویات اور علاج کے جدید طریقوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے تو صرف یہ جاننا ہے کہ میرے بابا کی حالت آخر کیوں خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔"

آواز کے ساتھ اب جویریہ کی آنکھیں بھی بھرنے لگیں۔ اتنے عرصے کی فرسٹریشن تھی، جو اب نکل کر باہر آ رہی تھی۔

حذیفہ کو اس کی باتوں سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ پچھلے چند مہینوں کے دوران کتنی ٹینشن کا شکار رہی ہو گی۔

یہ سچ تھا کہ ندیم صاحب کو دل کا مرض لاحق تھا مگر یہاں ہسپتال وہ اپنے دل کے ہاتھوں نہیں، بلکہ دماغ کی شریان پھٹ جانے کے سبب پہنچے تھے۔ دل کی تکلیف کے ساتھ خدا جانے اس بیماری کو بھی ندیم صاحب کب سے اپنے اندر پال رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے اچانک پھٹ جانے کی وجہ شدید ذہنی دباؤ یا پریشانی بھی ہو سکتی تھی۔

جویریہ سب تفصیلات نہیں جانتی تھی حالانکہ اس کا حق تھا جاننے کا۔ وہ ندیم صاحب کی بیٹی تھی لیکن اس کی رات والی حالت کو دیکھ کر حذیفہ اسے کچھ بھی بتا نہیں پایا۔

حذیفہ نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"انکل اب کافی بہتر ہیں۔ میں تھوڑی دیر پہلے انہیں دیکھ کر آیا ہوں۔" اس نے جویریہ کو تسلی دی۔

جویریہ نے حذیفہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کرسی پر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی تھی۔ حذیفہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکن اب اس کے اعصاب پر حاوی ہونے لگی تھی۔

"اگر میرے بابا کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔"

برابر والے صوفے سے آنے والی آواز پر حذیفہ کی آنکھیں ایک جھٹکے کے ساتھ کھلیں۔

جویریہ کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس لڑکی کو یہ خوف بھی ہو گا کہ وہ واحد رشتہ جس پر وہ ساری زندگی انحصار کرتی آئی ہے، اس سے چھن گیا تو کیا ہو گا۔ محب کی بہت پہلے کہی بات حذیفہ کے

ذہن میں اچانک گونجی۔

"کچھ نہیں ہو گا تمہارے بابا کو۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" بے چینی کو دباتے اسے سرزنش کی۔

"انہیں ٹھیک ہونا پڑے گا ورنہ میرے جینے کا بھی کوئی مقصد نہیں رہے گا۔" جویریہ روتے ہوئے بولی۔

"میں نے آج تک اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا، صرف اپنے بابا کے لیے کیا، پوری دنیا میں صرف ایک وہی ہیں جو مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میری کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں۔ ورنہ جویریہ ندیم جیسی لڑکی جیے یا مرے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جویریہ نے تلخی کے ساتھ کہا۔

حذیفہ جانتا تھا کہ یہ بات وہ اپنی ماں کے بارے میں کہہ رہی ہے۔ اس ماں کے بارے میں جس کے نام کا ورق اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ دینے کے باوجود وہ اس ورق پر لکھے لفظوں کی کڑواہٹ کو آج تک نہیں بھلا پائی تھی۔

"اگر میں کہوں کہ مجھے فرق پڑتا ہے تو؟" حذیفہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

جویریہ ایک دم سے سن رہ گئی۔

"مم میں سمجھی نہیں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ تمہیں ابھی تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔"

حذیفہ سر ہلا کر اس کی عقل پر جیسے ماتم کرتے ہوئے بولا۔ "فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ تمہارے بابا کے علاوہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے، جس کے لیے تم بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہو۔"

حذیفہ کے اس اعتراف کے بعد نہ سمجھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

جویریہ کو اپنے گال بے تحاشا گرم ہوتے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں..... جس طرح تم نے ہمارا ساتھ دیا کوئی اور ہوتا تو شاید ہی دے پاتا۔"

اپنے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ندیم صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ کمزوری کی وجہ سے انہیں بات کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں انکل!" حذیفہ بولا۔ "اس میں شکریہ ادا کرنے والی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

ندیم صاحب کی طبیعت اب پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر بھی زیادہ بات چیت کرنے یا ذہن پر زور ڈالنے سے سر بھاری اور بوجھل ہو جاتا تھا۔

ہسپتال سے انہیں فی الحال چھٹی نہیں ملی تھی۔ ڈاکٹر انہیں مزید ایک آدھ دن انڈر آبزرویشن رکھنا چاہتے تھے۔

"تم لیفٹ ہینڈڈ ہو؟" ندیم صاحب نے حذیفہ کو الٹے ہاتھ میں چھری پکڑ کر سیب کاٹتے دیکھ کر پوچھا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"حیرت ہے۔" اس کے سر ہلا کر اقرار کرنے پر ندیم صاحب بولے۔

"میرے لیفٹ ہینڈڈ ہونے پر آپ کو حیرت ہے؟" حذیفہ نے کہا۔

"نہیں! حیرت اس بات پر ہے کہ میں نے آج سے پہلے کبھی اس چیز پر غور کیوں نہیں کیا۔ ویسے سنا ہے کہ لیفٹ ہینڈڈ بہت ذہین ہوتے ہیں۔"

"اور اب ملنے کے بعد کیا خیال ہے آپ کا؟" حذیفہ نے پوچھا۔

"اب..... اس نظریے کی تصدیق بھی ہو گئی۔" ندیم صاحب دھیمے سے مسکرائے پھر تھوڑا ٹھہر کر بولے۔

"تم صرف ذہین ہی نہیں بلکہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہو۔" ندیم صاحب کے منہ سے اپنی تعریف سن کر حذیفہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"اچھا تو میں ہمیشہ سے ہی ہوں۔ بس آپ کو اب پتا چلا ہے۔"

"پتا تو مجھے اسی روز چل گیا تھا جس روز تم سے پہلی

بار ملاقات ہوئی تھی۔" ندیم صاحب نے کہا۔

"گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان ہے۔" حذیفہ نے ہنس کر کہا۔

"تم سے ایک سوال کروں حذیفہ!" انہوں نے اچانک حذیفہ کی طرف دیکھا "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" حذیفہ نے ان سے نظریں ملاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ بہت پہلے سے تیار تھا۔ ندیم صاحب کچھ دیر اسی طرح جانچتی نظروں سے حذیفہ کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی بیٹی کے باپ کو اتنا کم فہم نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی نوجوان اس سے آکر کہے کہ وہ محض ملنے یا خیریت دریافت کرنے آیا ہے اور باپ اس پر یقین کر لے۔"

"آپ بالکل بھی کم فہم نہیں ہیں۔" حذیفہ نے آہستہ سے کہا۔

ندیم صاحب چپ ہو گئے۔ حذیفہ کو عجیب سا احساس ہوا ان کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے تھے۔

"کیا ہوا انکل؟" حذیفہ تیزی کے ساتھ ان کے قریب آیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے پائے۔

"میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔" حذیفہ ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ درد میرے جسم میں نہیں، میری روح کے اندر ہے بیٹا۔! اور اس کو رفع کرنے کی کوئی دوا ان ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔" ندیم صاحب نے ہولے سے جواب دیا۔

"اتنی مایوسی کی باتیں مت سوچیے۔ آپ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں۔" حذیفہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ ان سے کیا کہے مگر ندیم صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔

"کل تک میں بھی اپنی حالت اور تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔ تم اسے مایوسی کہو یا حقیقت پسندی لیکن میں اب اس بات سے نظریں نہیں چرا سکتا کہ میرا وقت آچکا ہے۔"

"انکل پلیز......"

"مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دو حذیفہ! میں نے بہت مشکل سے تم سے بات کرنے کے لیے ہمت جمع کی ہے.... جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ کہنے کا شاید مجھے اس کے بعد موقع نہ مل سکے۔" ندیم صاحب نے منت بھرے لہجے میں کہا تو حذیفہ چپ ہو گیا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ جویریہ کی ماں حیات ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔" ندیم صاحب نے بتانا چاہا۔

"میں جانتا ہوں۔ جویریہ مجھے ان کے بارے میں بتا چکی ہے۔" حذیفہ نے آہستہ سے کہا تو ندیم صاحب نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کہنے لگے۔

"جویریہ اپنی ماں کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی نہیں۔ یہ وہ قصہ ہے جسے وہ برسوں سے اپنے اندر دفن کیے بیٹھی ہے۔ وہ اس کی تکلیف سے اندر ہی اندر گھلتی ہے، مگر اسے اپنی زبان پر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

ندیم صاحب سانس لینے کے لیے رکے۔

"ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ نہایت تیز رفتار دور میں نہایت تیز رفتار زندگیاں گزار رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا، ستانے کا وقت ہی کسی کے پاس نہیں ہے۔ مگر میں جس مقام پر آکر رکا ہوں، وہاں سے آگے کا راستہ غیر یقینی ہے۔ اس مقام پر مجھے اپنی گزری زندگی پر نظر ڈالنے کا ایک موقع ملا ہے، میں نے اپنی زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ سب سے بڑی غلطی حق کی لڑائی میں دستبردار ہونے کی تھی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے لڑنا چاہیے تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنی بیٹی کے حق کے لیے پر میں نہیں لڑا۔ کیونکہ تب مجھے لگتا تھا کہ جو چیز نصیب میں نہ ہو، اسے زبردستی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

مگر میں غلط تھا۔

کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا واقعی نصیب کے کھیل ہیں۔ مگر کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا بزدلی ہے.... اور زندگی کے اس مقام پر آکر مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے نہایت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں ایک بزدل انسان ہوں۔ زندگی کے اس موڑ پر میں خود سے سرزد ہوئی غلطیوں کو اب پلٹ کر دیکھ تو سکتا ہوں مگر افسوس کہ انہیں سدھار نہیں سکتا۔ جویریہ میری بیٹی ہے اور اسے بھی میری طرح اپنے حق کے لیے لڑنا نہیں آتا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ جو محرومیاں زندگی بھر میرا مقدر رہیں، وہ میری بیٹی کے حصے میں نہ آئیں۔ وہ اپنی محنت اور قابلیت سے ہر وہ مقام حاصل کرے، جو میرے حوالے سے اسے کبھی نہیں مل سکتا۔ پر اب لگتا ہے کہ یہ سب ہوتا دیکھنے کا موقع مجھے نہیں مل سکے گا۔"

ندیم صاحب نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ حذیفہ چپ چاپ انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت حذیفہ کو ندیم صاحب کے پیچھے کھڑکی میں لٹکتے زرد پردوں کی پیلاہٹ ان کی رنگت سے میل کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اگر مجھے تھوڑی سی بھی امید ہوتی کہ اس کی ماں کے دل میں یا اس کے گھر میں جویریہ کے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو میں جویریہ کی مرضی کی پرواہ کیے بغیر الماس سے رابطہ ضرور کرتا لیکن مجھے ایسی کوئی امید بھی نہیں.... اور میں اپنی بیٹی کو اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا اور تم حذیفہ...... تم اس بوجھ کو ہلکا کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔"

ندیم صاحب نے حذیفہ کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" حذیفہ حیران ہو کر بولا۔

"تم جویریہ سے شادی کر لو..... ابھی میرے سامنے، تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔"

یہ یقیناً ان کی مایوسی کی انتہا تھی۔

"تم اچھے خاندان کے لڑکے ہو اور میں جانتا ہوں کہ اچھے خاندانوں میں رشتے اس طرح نہیں جوڑے جاتے۔ اسے میری خود غرضی سمجھ لو یا پھر کچھ اور.... بعض اوقات زندگی میں ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جب عقل، سمجھ، تجربہ سب انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں فقط ایک دل ہی رہ جاتا ہے رہنمائی کے لیے.... اور میرا دل کہتا ہے کہ تم میری بیٹی کی حفاظت کر سکو گے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تم سے جو مانگ رہا ہوں، وہ کوئی معمولی چیز نہیں اس لیے اگر تم انکار کر دو گے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ صرف یہ گزارش کروں گا کہ آئندہ زندگی میں کبھی بھی جب اس قصے کو یاد کرو تو ایک بے بس اور پریشان باپ کی مجبوری میں کی گئی درخواست کے طور پر یاد کر کے درگزر کر دینا۔"

ندیم صاحب نے آنکھیں جیسے تھک کر موند لیں یا پھر شاید حذیفہ سے اس نمی کو چھپانا مقصود تھا جو ان کی پلکوں پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

حذیفہ نے ندیم صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا جو ایک لاچار باپ کا چہرہ تھا جس کی آنکھوں کے گرد پڑے گہرے حلقے ان کے فکر و تردد کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"میں تیار ہوں۔"

☼ ☼ ☼

وہ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جویریہ کے لیے اپنے دل میں پنپنے والے جذبات کے بارے میں حذیفہ کو کبھی کوئی کنفیوژن نہیں تھی۔ وہ ایسا لڑکا نہیں تھا جو محض وقت گزاری یا تفریح کے لیے کسی بھی لڑکی میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جویریہ سے شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسے پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ تب مام اور ڈیڈ

کو اپنی پسند سے آگاہ کر کے معاشرے کے رسم و رواج کے مطابق جویریہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا تھا۔

حذیفہ کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

کیا اسے بھی یہی لگنے لگا تھا کہ ندیم صاحب کے پاس اب مہلت نہیں رہی؟ کیا وہ بھی ان ہی کی طرح قنوطیت کے آہنی شکنجے میں جکڑا گیا تھا جو اس طرح جویریہ سے شادی کے لیے رضامند ہو گیا۔

"نہیں، ایسا ہر گز نہیں تھا۔" حذیفہ نے اپنے آنا" فانا" کیے فیصلے کے پیچھے چھپی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے سوچا۔

اس کی وجہ دراصل دل میں اچانک ابھرنے والا یہ احساس تھا کہ اگر اس نے اس وقت اقرار نہ کیا تو وہ جویریہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔

یہ احساس کہاں سے آیا اور کیوں آیا؟ اس کی وضاحت وہ کسی اور کو تو کیا خود کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔

بس وہ اتنا جانتا تھا کہ یہ ایک ایسا احساس تھا جو عقل و خرد کے تمام اصولوں کو رد کرتے ہوئے اچانک دل میں جاگتا ہے اور اپنی منوا کر رہتا ہے۔

"شاید ندیم صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ بعض اوقات تمام تجربے، عقل اور سمجھ کو پس پشت ڈال کر دل کی مان لینے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔"

حذیفہ نے باہر احاطے میں ——— بھاگتے لڑکوں کو غائب دماغی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس نے گہرا سانس لے کر جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

"ہیلو ڈیڈ! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" حذیفہ نے فون پر دانش سے کہا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔

اسمارہ نے گرم شال کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹا۔ انہیں ویسے بھی سردی زیادہ لگتی تھی۔

انہیں دانش کا انتظار تھا۔ دانش کو آنے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی۔ گلہ اس لیے نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ دانش نے اپنی اس مصروفیت کے بارے میں انہیں یہاں آنے سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ کام اسی طرح جنونی انداز میں کیا کرتے تھے۔

کھڑکی سے باہر آسمان سلیٹی رنگ کے بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ محکمہ موسمیات کے مطابق آج بارش کا امکان تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ برسات بھی شروع ہو گئی جس کی محکمہ موسمیات والوں نے پیش گوئی کی تھی۔

اسمارہ کو اب پریشانی ہونے لگی۔

اگر ایسی برسات پاکستان کے پہاڑوں میں بھی شروع ہو گئی تو لینڈ سلائیڈنگ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اگر آنے جانے کے راستے بند ہو گئے تو حذیفہ اور اس کے دوست کئی دن تک شمالی علاقہ جات میں پھنسے رہ سکتے تھے۔

دانش کا سوچتے سوچتے اسمارہ کو حذیفہ کی فکر نے آ گھیرا۔

حالانکہ حذیفہ کے اس ٹرپ کا انہیں بہت پہلے سے پتا تھا اور تب انہیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ پھر آج بلاوجہ ہی ان کا دل کیوں گھبرائے جا رہا تھا۔

اسی وقت اسمارہ کے پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی۔

دانش کو کام کے دوران بار بار فون کر کے ڈسٹرب کرنا اسمارہ کو پسند نہیں تھا۔ دیر سویر ہونے کا امکان ہوتا تو دانش خود ہی فون کر کے اطلاع دے دیا کرتے تھے یہ یقیناً" ان ہی کا فون تھا۔ اسمارہ نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!"

دوسری جانب دانش نہیں کوئی اور تھا اور جو کچھ اس نے کہا، اسے سن کر اسمارہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

☼ ☼ ☼

پھر سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ جویریہ کو ٹھیک سے

سمجھنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

قاضی کے علاوہ محلے کے چیدہ چیدہ افراد کو بطور گواہ حذیفہ جا کر کب اور کیسے لے کر آیا، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کا کام بس سر جھکا کر دھندلائی آنکھوں سے نکاح نامے پر دستخط کرنا تھا۔ ضبط کے بندھن اس وقت ٹوٹے جب ندیم صاحب نے پاس بلا کر اسے سینے سے لگایا۔

وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ندیم صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ کر ان کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔

"بس کرو جویریہ! اپنے بابا کو اب آرام کرنے دو۔" روتی ہوئی جویریہ کو اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔

یہ حذیفہ کے ساتھ جڑے نئے تعلق کا احساس تھا یا کچھ اور کہ اس کے چھوتے ہی وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے ندیم صاحب کے سینے میں اور زیادہ سمٹ گئی۔

"اسے تھوڑی دیر میرے پاس رہنے دو۔ میرے سر سے آج بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔"

ندیم صاحب نے جویریہ کے سر کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا تو حذیفہ خاموش ہو گیا۔ وہ رات ان کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔ شاید وہ جویریہ ہی کی خاطر اپنے رب سے مہلت مانگ کر جی رہے تھے۔ اس کی فکر سر سے اترتے ہی انہوں نے اپنا آپ بخوشی فرشتہ اجل کے حوالے کر دیا۔

جویریہ کے لیے وہ صبح قیامت کی صبح تھی۔

ندیم صاحب کی بیماری ان کی گرتی صحت، ہر چیز کو دیکھنے کے باوجود کہ اس بیماری کا اختتام موت پر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس کمرے میں قدم رکھا جو کبھی ندیم صاحب کا ہوا کرتا تھا۔

حذیفہ کے آنے سے پہلے اسے بہت سے کام نپٹانے تھے اور اس میں سب سے مشکل اور ضروری کام سامان کی پیکنگ کا تھا۔

حذیفہ نے اس سے کہا تھا کہ اپنے مام ڈیڈ کے واپس لوٹتے ہی وہ اسے لاہور لے جائے گا۔ اس لیے سب تیاری مکمل ہونی چاہیے۔

بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔

جویریہ نے دیکھا تو حذیفہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"چائے لاؤں؟" جویریہ نے پوچھا۔

"نہیں ایک گلاس پانی پلا دو۔" وہ ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابیاں صوفے کے برابر رکھی لکڑی کی گول میز پر پھینکتا ہوا بولا۔

"ٹھہرو۔" جویریہ پانی لینے کے لیے مڑنے لگی تو حذیفہ نے اچانک ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ پھر جویریہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے اس کی سوجی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔

"تم روئی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"بابا یاد آ رہے تھے۔" جویریہ نے رندھی آواز میں اعتراف کیا۔

وہ کچھ دیر جویریہ کی طرف نہایت غور سے دیکھتا رہا پھر نہایت آہستگی کے ساتھ جویریہ کو خود سے قریب کرتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

جانے یہ تسلی دینے کا انداز تھا یا ہمت بڑھانے کا، مگر جویریہ کو نہ پیروں کے نیچے بچھی زمین یاد رہی، نہ سر پر ٹکا آسمان۔ وہ کتنی دیر حذیفہ کی بانہوں کے حلقے میں دم سادھے اس کے سینے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ حذیفہ نے ہی اس کے ماتھے پر دھیرے سے بوسہ دیتے ہوئے اس کو خود سے الگ کیا۔

کچن میں جا کر وہ کتنی دیر اپنے دھک دھک کرتے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

جب وہ پانی لے کر واپس آئی تو حذیفہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا جویریہ نے پانی کے گلاس کے

ساتھ حذیفہ کا موبائل بھی پکڑایا۔

"یہ بابا کے کمرے میں پڑا تھا۔" جویریہ نے بتایا۔

حذیفہ نے پانی پیتے ہوئے موبائل کے الرٹس دیکھنے شروع کیے۔ پچھلے چار دن سے کچھ ایسی بھاگ دوڑ رہی تھی کہ اسے اپنا موبائل یاد ہی نہیں تھا۔

کچھ دوستوں کے میسج، کچھ اسمارہ کی کالز۔ اس کے بعد ایک لمبی لسٹ تھی میسجز اور فون کالز کی جو تقریباً ساری عرشی کے موبائل سے کی گئی تھیں۔ کہیں کہیں اس میں رعنا کے نمبر بھی شامل تھے۔

عرشی تو خیر ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی دن میں کئی میسجز اور کالز کیا کرتی تھی پر یہ رعنا کے نمبر؟ حذیفہ کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

موبائل پر میسج اور کال الرٹس کے علاوہ کونے میں بنا ننھا سا بیٹری کا نشان جھپک جھپک کر چار دن کے فاقے کی دہائیاں دے رہا تھا۔

حذیفہ کی سب سے پہلی ترجیح لندن کال کرنا تھی۔ نکاح والے دن کے بعد سے دانش سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ابھی اس کی انگلیاں پہلا بٹن بھی نہیں دبا پائی تھیں کہ ہاتھ میں پکڑا موبائل یکدم تھرا اٹھا۔

اسکرین پر جگمگاتا ہوا عرشی کا نام اس کی طرف سے آنے والی کال کی اطلاع دینے لگا۔

"ہیلو!" حذیفہ نے فون کان سے لگایا۔

"تھینک گاڈ! تم نے فون تو اٹھایا۔ تم ہو کہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کتنے پریشان ہیں۔ پہلے ہم سمجھے کہ پہاڑی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سگنل نہیں مل رہا۔ پر کل مظہر لوگ اسلام آباد پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ سرے سے گئے ہی نہیں۔ تم آخر ہو کہاں؟ تمہیں فون کر کے انگلیاں دکھ گئیں۔ تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟"

عرشی اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بے تکان بولے چلی گئی۔

"لاؤ! مجھے دو۔" حذیفہ کو فون پر رعنا کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو حذیفہ!" رعنا نے عرشی سے فون غالباً "چھین" کر لیا تھا۔

"تم کہاں ہو بیٹا! ہم تو سخت پریشان ہو گئے تھے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے تم؟"

انہوں نے بھی شدید پریشانی کے عالم میں وہی کچھ دہرایا جو عرشی کہہ رہی تھی۔

"ریلیکس خالہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے رعنا کو تسلی دی۔ "آپ بتایئے، اتنے فون کیوں کر رہی تھیں؟"

اس کے سوال پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"حذیفہ! تم.... تم فوراً واپس آجاؤ۔"

رعنا جب بولیں تو انہوں نے حذیفہ کے سوال کا جواب دینے کی بجائے یہ فرمائش کر دی۔ حذیفہ کو فون پر رعنا کی آواز بھاری بھاری سی لگی۔

"کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

"نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔" رعنا نے جلدی سے کہا تو وہ چونک گیا۔

"خالہ! بات کیا ہے؟ مام تو ٹھیک ہیں نا؟ کہاں ہیں وہ؟" حذیفہ کا پہلا دھیان اسمارہ کی طرف ہی گیا۔ ہزار طرح کے وسوسے اسے پریشان کرنے لگے۔

"ہاں! وہ ٹھیک ہے۔ وہ ابھی وہیں لندن میں ہے۔ بس! تم جلدی سے واپس آجاؤ۔" وہ بولیں۔

"خالہ! فار گاڈ سیک مجھے بتایئے! آخر ہوا کیا ہے؟" حذیفہ کی چھٹی حس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر رعنا کی سسکی سنائی دی۔

"ہیلو!" عرشی نے رعنا کے ہاتھ سے فون پکڑ کر کہا۔

"عرشی! کیا ہوا ہے؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

"سوری حذیفہ! بٹ انکل از نو مور۔" (سوری حذیفہ! انکل اب نہیں رہے)

عرشی نے جواب میں اس سے کہا۔

ساتھ ہی موبائل کی بیٹری مکمل ڈسچارج ہو گئی۔

جویریہ الماری سے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھ رہی تھی جب اسے کچھ گر کر ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی کے ساتھ باہر آئی۔

شیشے کا گلاس حذیفہ کے قدموں میں ٹوٹا پڑا تھا۔ کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سارے کمرے میں یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔

جویریہ نے حذیفہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور وہ پتھرائی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جویریہ کو کچھ غلط، بلکہ بہت غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"کیا ہوا؟" جویریہ نے سہمے دل کے ساتھ پوچھا۔

اس کی آواز پر حذیفہ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اسے جانتا تک نہ ہو۔

ان چند خوفناک لمحوں کے دوران جویریہ کو اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آخر کار حذیفہ کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق واپس آئی۔

"جویریہ! میرے ڈیڈ.... میرے ڈیڈ اس دنیا میں نہیں رہے۔" جویریہ دھپ سے پیچھے رکھے صوفے پر گر گئی۔ ٹانگیں واقعی بے جان ہو گئیں۔

"وہ گزر بھی گئے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔" حذیفہ وحشت زدہ ہو کر بول رہا تھا۔

"او گاڈ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل ٹھیک تھے۔"

حذیفہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گراتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ وہ ان کا موازنہ ندیم صاحب کے ساتھ کر رہا تھا۔

ایک طرف ندیم صاحب بیمار، شکستہ حال اور زندگی سے مایوس اور دوسری طرف اس کے ڈیڈ۔ مستقبل سے پر امید، آنے والے دنوں کے لیے ڈھیروں پلان بنانے والے چاق و چوبند انسان۔

دونوں کو ہی موت اپنے ساتھ لے گئی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ندیم صاحب کی موت دروازے پر دستک دے کر، انہیں اطلاع دے کر آئی تھی جبکہ دانش کی بنا بتائے۔ اچانک صوفے پر اپنا بے جان وجود لیے بیٹھی جویریہ اس بیٹے کو اذیت سے گزرتا دیکھ رہی تھی جسے اپنے باپ کی وفات کی خبر اس لیے بروقت نہ مل سکی کیونکہ وہ اس کے باپ کی آخری رسومات نبھانے میں مصروف تھا۔ وہ ایسے وقت پر اپنے پیاروں، اپنے گھر والوں کے پاس نہ پہنچ سکا جب اس کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ ندیم صاحب کی سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو نبھا رہا تھا۔

پتا نہیں حذیفہ کا دھیان اس نکتے کی طرف گیا تھا یا نہیں لیکن جویریہ کو یہ خیال تاحیات احساس جرم میں مبتلا رکھنے کے لیے کافی تھا۔

"مجھے جانا ہو گا۔" حذیفہ نے بالآخر اپنا سر اٹھا کر کہا۔ "مام ابھی تک وہیں پر ہیں اور ڈیڈ کی ڈ.... ڈیڈ.... مجھے ان کو جا کر لانا ہو گا۔"

وہ ڈیڈ باڈی کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اپنے باپ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر پایا۔

وہ اتنا ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی جویریہ سے اس کی بات پر سر ہلانے کے علاوہ کچھ کہا نہیں گیا۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو ایئرپورٹ سے باہر آتا دیکھ کر رعنا کے دل کو دھکا لگا۔

یہ وہ اسمارہ نہیں تھیں جو دس دن قبل یہاں سے لندن روانہ ہوئی تھیں۔ حذیفہ کا بازو تھامے ہوئے وہ انتہائی ہراساں اور خوف زدہ کیفیت میں باہر آ رہی تھیں۔

صرف دس دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

اسمارہ سے گلے ملنے کے بعد انہوں نے حذیفہ کی طرف دیکھا۔

وہ چپ تھا۔ بہت چپ۔

یہ وہی لڑکا تھا جو اگر خاموش ہوتا تو اس کی آنکھیں بولا کرتی تھیں۔ آج ان آنکھوں کے پاس بھی کہنے کو

کچھ نہیں تھا۔
سارے الفاظ اس پل ہی ختم ہو گئے تھے جس پل ان آنکھوں نے دانش کے زندگی سے عاری وجود کا نظارہ کیا تھا۔
"خالہ! آپ مام کو گھر لے جائیں، میں بعد میں آتا ہوں۔"
حذیفہ نے اسمارہ کو رعنا کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور خود واپس مڑ گیا۔
اپنی ماں کو وہ ایرپورٹ سے باہر لے آیا تھا۔ اب باپ کو لینے جا رہا تھا۔ وہ باپ، جو اپنے پیروں پر چل کر گیا تھا اور تابوت میں لوٹ کر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دانش اپنے حلقہ احباب میں ایک نہایت مقبول اور ہردلعزیز شخصیت تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا کئی دن تک صبح سے شام تک تانتا بندھا رہا۔
رشتہ دار، دوست احباب، آفس کا اسٹاف، فیکٹری کے ورکر، کون تھا جو دانش کی اچانک موت پر افسوس کا اظہار کرنے نہیں آیا۔
حیرت انگیز طور پر یہ ساری آمدورفت اسمارہ کو اپنے تنہا اور اکیلے رہ جانے کا احساس اور بھی شدت سے دلاتی۔
دانش اور ان کا ساتھ برسوں پر محیط تھا۔ اب انہیں نئے سرے سے ایک ایسے شخص کے بنا اپنی زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا تھی جو پچھلے ستائیس سال سے ان کی زندگی کے ہر لمحے میں شامل رہا تھا۔
باقی سب تکلیفیں اور پریشانیاں ایک طرف لیکن اسمارہ شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگیں۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اب اکیلی رہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔
اس اکیلے پن کو دور کرنے کا بہترین حل رعنا اور اسمارہ نے مل کر نکالا۔
"یہ آپ لوگ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں عرشی سے شادی نہیں کر سکتا۔" دونوں بہنوں کی توقع کے خلاف حذیفہ نے اس تجویز کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

"مگر کیوں؟ آخر کوئی تو وجہ ہو گی انکار کی۔" یہ رعنا تھیں۔
اور پھر انکار کی جو وجہ حذیفہ نے بیان کی وہ رعنا اور اسمارہ کی جان نکال دینے کے لیے کافی تھی۔
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اسمارہ نے شدید شاک کے عالم میں کہا۔ رعنا بھی اس انکشاف پر انگشت بدنداں تھیں۔
"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟"
حذیفہ ان کے ساتھ ایسا بھونڈا مذاق نہیں کر سکتا۔ یہ رعنا بہت اچھی طرح سے جانتی تھیں، پھر بھی انہوں نے بہت امید کے ساتھ پوچھا، پر حذیفہ نے نفی میں سر ہلا کر ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔
"یہ نہیں ہو سکتا۔ تم ہمیں بتائے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔" اسمارہ بے یقینی کے عالم میں بولیں۔
"یہ ہو چکا ہے مام! ڈیڈ کو پتا تھا۔ انہیں شاید آپ کو بتانے کا موقع نہیں ملا۔"
حذیفہ نے افسردگی سے کہا تو اسمارہ ایک دم ڈھے گئیں۔
"میرے ڈیڈ میرے بیسٹ فرینڈ ہیں۔ تم دیکھنا وہ مام کو ضرور کنوینس کر لیں گے۔"
صرف چند دن قبل حذیفہ نے یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ جویریہ سے کہی تھی۔
"وہ ناراض تو نہیں ہیں نا؟" ہر لڑکی کی طرح جویریہ کے دل میں بھی بہت سے خدشات تھے۔
"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" حذیفہ نے ذرا رک کر کہا۔ "جب میں نے ان سے بات کی تو وہ تھوڑا سا مایوس ضرور ہوئے تھے۔ لیکن خود کو ان کی جگہ پر رکھ کر دیکھو! ان کا اکلوتا بیٹا ان کی غیر موجودگی میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہے جسے وہ جانتے نہیں، کبھی ملے تک نہیں، تو ان کی یہ مایوسی بھی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جانتی ہو، انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے اور انہیں یقین ہے کہ میں نے جس بھی لڑکی کا انتخاب کیا ہو گا" وہ یقیناً" لاکھوں میں ایک ہو گی۔ ان کی

تمہارے بابا سے بھی فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ ساری صورت حال سمجھ گئے ہیں۔ اب صرف مام کا مسئلہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیڈ انہیں بھی منا لیں گے۔"
حذیفہ نے جویریہ کو یقین دلایا تھا۔
پر اب..... اب ڈیڈ ہی نہیں رہے تھے۔
اور دانش کی مدد کے بغیر اسمارہ کو راضی کرنا حذیفہ کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ کے انکار کے بعد گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا جس میں اکیلا حذیفہ ایک طرف اور باقی سب دوسری طرف تھے۔
اس کی بات کو سمجھنا تو درکنار کوئی اس کی بات سننے کو بھی تیار نہ تھا۔
صرف عرشی تھی جو خبر ملتے ہی دوڑی چلی آئی۔
"حذیفہ! تم نے اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت میرے بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچا؟" اس کی شکایت بھری آنکھوں میں ڈھیروں گلے تھے۔
"عرشی! میں نے تمہارے بارے میں کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔" حذیفہ اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ عرشی بھی اس معاملے میں رعنا و اسمارہ کی ہم خیال ہو گی۔
"تو اب سوچ لو۔" عرشی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔
"اب؟" حذیفہ نے حیرت سے عرشی کو دیکھا۔
"اب یہ کیسے ممکن ہے؟ میں کسی اور سے شادی کر چکا ہوں۔" اس نے کہا تو عرشی کو اپنے ارمانوں کی دنیا ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی نظر آئی۔ ساری عمر اپنی ہر آرزو کو زبان سے ادا ہونے سے قبل ہی پورا ہوتا دیکھنے والی عرشی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کے حصول میں وہ ناکام رہ جائے گی۔

☼ ☼ ☼

عرشی بی بی کو "دورہ" پڑنے کی اطلاع رعنا کو ان کے بیڈ روم میں ملازمہ نے آ کر دی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ بھنا کر بولیں۔
پھر ملازمہ کی خوف زدہ شکل دیکھ کر رعنا کو احساس ہوا کہ ایک ادنیٰ نوکرانی اتنی بڑی بات کہنے کی گستاخی بے وجہ نہیں کر سکتی۔
رعنا دوڑتی ہوئی عرشی کے کمرے میں پہنچیں جہاں وہ کارنس، میزوں اور سائیڈ ٹیبلوں پر سجی بیش قیمت اشیا کو دیواروں اور فرش پر مار مار کر چکنا چور کر رہی تھی۔
جب اس کا دل ہی ثابت نہیں رہا تو باقی چیزوں کی کیا حیثیت تھی؟ جی چاہ رہا تھا پوری دنیا کو تہس نہس کر دے۔
"بس کرو عرشی!" رعنا نے قریب آتے ہوئے اس کو بازوؤں سے جکڑ کر پکڑ لیا۔
عرشی نے ایک سیکنڈ اپنے آپ کو رعنا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی، پھر بے دم ہو کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔
یوں بھی اب کمرے میں توڑنے لائق کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ عرشی کے ارمانوں سمیت سب کرچی کرچی ہو چکا تھا۔
"اس نے مجھے ریجیکٹ کر دیا ممی!" عرشی نیم دیوانگی کے عالم میں بولی۔ "اس نے کہا کہ اس نے میرے بارے میں کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں جبکہ میں نے تو ساری زندگی اس کے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچا، پھر وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟"
عرشی ایک دم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کو تھامے کھڑی رعنا کو اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اسے چھوڑنا پڑا۔
"میں نے اپنی آنے والی زندگی کے کسی بھی لمحے، کسی بھی پل کے بارے میں جب بھی سوچا ہمیشہ اسے ہی اپنے ساتھ تصور کیا۔ اپنے خیالوں تک میں کسی اور کو اس کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دی۔ پھر اس نے میری جگہ اتنے آرام سے کسی اور کے حوالے کیسے کر دی؟"

عرشی نے سر اٹھا کر رعنا سے پوچھا تو وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اس کے سوال کا رعنا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس وقت ماربل کے فرش پر بیٹھ کر روتی ہوئی عرشی انہیں سچ مچ پاگل لگی۔

"بس کرو عرشی! خدا کے لیے اب بس کرو۔"

اس کا رونا رعنا کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ عرشی کا ہر آنسو رعنا کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

انہوں نے عرشی کو کھینچ کھانچ کر فرش سے اٹھایا اور بستر پر لٹا کر چادر اوڑھادی۔

عرشی کسی چھوٹے بچے کی طرح چادر میں چھپ کر لیٹ گئی۔ اتنی تابع داری عرشی نے آج سے پہلے کبھی نہیں دکھائی تھی۔ رعنا کو اس کی اس فرماں برداری سے خوف آنے لگا۔ یہ عرشی کے نارمل ہونے کی نشانی نہیں تھی۔

اس ساری تخریبی کاروائی کے بعد عرشی ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال ہو چکی تھی۔

"میں حذیفہ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔" چادر کے نیچے سے عرشی نیم غنودگی میں بڑبڑائی تو رعنا سن رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"اسمارہ! یہ کیا تماشا ہے۔ سمجھاؤ اپنے بیٹے کو۔" رعنا نے بگڑ کر کہا۔

"میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں آپا! پر وہ نہیں مان رہا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔" اسمارہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

رعنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ عرشی کا پاگل پن رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کر کے اس مسئلے کا حل نکالنا چاہتی تھیں مگر کریں تو کیا کریں؟

گو کہ رعنا نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی تھی مگر عرشی کا جوڑ حذیفہ کے ساتھ بنے گا' اس بارے میں انہوں نے سوچا ضرور تھا اور اسمارہ رعنا کے مشوروں سے بہت کم انحراف کیا کرتی تھیں۔

وہ عمر میں رعنا سے چھوٹی تھیں۔ ساری عمر رعنا کے زیر اثر رہیں۔ رعنا کی شادی بھی ان سے کہیں پہلے ہوئی تھی۔ رعنا نے بچپن' لڑکپن اور پھر جوانی کے ایام کے اپنے تجربات و مشاہدات سے ہمیشہ اسمارہ کو مستفید کیا۔ صرف ایک جگہ اسمارہ کو رعنا پر فوقیت حاصل ہوئی اور وہ یہ کہ جہاں حذیفہ شادی کے سال بھر بعد ہی اسمارہ اور دانش کی زندگیوں کو پر رونق بنانے چلا آیا وہاں رعنا کی گود اپنی شادی کے دس برس گزر جانے کے بعد بھی خالی ہی تھی۔ اسی لیے جب ان گنت منتوں اور مرادوں کے بعد عرشی دنیا میں آئی تو رعنا اور ان کے مرحوم شوہر نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ عرشی کو بگاڑنے اور اسے ضدی بنانے میں اسی بے جا لاڈ پیار کا ہاتھ تھا۔

لیکن حذیفہ عرشی کو ہینڈل کر لیتا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ عرشی اگر کسی کی بات ماننے کا تکلف کر لیتی تھی تو وہ بس حذیفہ تھا۔ شاید اس چیز کو دیکھتے ہوئے رعنا کے دل میں عرشی اور حذیفہ کو ایک بندھن میں جوڑنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

بات اگر صرف رعنا کے دل میں پیدا ہونے والے خیال تک محدود ہوتی تو شاید رعنا موجودہ صورت حال پر سمجھوتا کر بھی لیتیں' پر اب سوال عرشی کی جنونی پسندیدگی کا بھی تھا اور رعنا کسی صورت اپنی لاڈلی بیٹی کی سب سے بڑی خواہش کو کسی گمنام لڑکی کا مقدر بننے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ دوسری طرف اسمارہ کے لیے بھی وہ لڑکی قابل قبول نہ تھی۔

جس لڑکی کے حسب نسب' شکل و صورت' عمر و عادات' کسی چیز کا بھی انہیں پتا نہیں تھا' اسے حذیفہ کی بیوی اور اپنی بہو کے طور پر تسلیم کر لینا اسمارہ کے لیے بہت مشکل تھا۔

ایک ماں کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تو اسمارہ کی سوچ بھی غلط نہیں تھی۔

"مجھے حذیفہ سے ایسی امید نہ تھی۔" اسمارہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔

"غلطی ہماری ہے۔ ہمیں غیر رسمی طور پر ہی سہی

مگر عرشی اور حذیفہ کے رشتے کو پہلے پکا کر لینا چاہیے تھا۔ خوامخواہ بچوں کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ حذیفہ کے علم میں پہلے سے یہ بات ہوتی تو اس کا دھیان ادھر ادھر نہ بھٹکتا۔" رعنا نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"پر اب کیا کریں؟" اسمارہ فکر مندی سے بولیں۔

"کچھ تو کرنا ہو گا۔" رعنا ابھی تک سر پکڑے بیٹھی تھی۔

اس وقت سر جوڑ کر بیٹھی دونوں بہنوں نے اس ان دیکھی' انجان لڑکی سے بے تحاشا نفرت محسوس کی جو ان کے نہ چاہنے کے باوجود زبردستی ان کی زندگیوں کا حصہ بننے چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جس سرد جنگ کا آغاز جویریہ کے ذکر کے ساتھ گھر میں شروع ہوا تھا وہ اب تک جاری تھی۔ دونوں فریقین اپنے اپنے موقف پر بدستور ڈٹے ہوئے تھے۔ حذیفہ کے لیے اس جنگ کو جیتنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تو کوئی اس کے قدم نہیں روک سکتا تھا۔

اور وہ آگے بڑھ بھی جاتا۔ اگر مخالفین کی صف میں اس کی اپنی ماں سب سے آگے نہ کھڑی ہوتی۔

حذیفہ اپنی فتح کا مینار اپنی ماں کے ارمانوں کے ملبے پر تعمیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کئی دن مصالحت کی کوششوں میں گزار دینے کے بعد حذیفہ کو یہ قبول کرنا پڑا کہ مفاہمت کی امید میں مزید وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔

اس نے اسمارہ سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

حذیفہ جب اسمارہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر پر نیم دراز ہتھیلی پر رکھی گولیاں پانی کے ساتھ نگل رہی تھیں۔

"امینہ! مجھ سے کوئی ملنے آئے تو کہہ دینا میں آرام کر رہی ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔"

انہوں نے خالی گلاس پاس کھڑی ملازمہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ امینہ گلاس لے کر کمرے سے باہر چلی گئی مگر حذیفہ وہیں کھڑا رہا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ ہدایت خاص طور پر اسے سنانے کے لیے ہی دی گئی تھی۔

"مام!" اس نے بستر کے قریب آتے ہوئے اسمارہ کو پکارا۔

"ابھی نہیں حذیفہ! پھر کسی وقت بات کریں گے۔" اسمارہ نے چادر اوپر کھینچتے ہوئے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"کبھی نہ کبھی تو بات کرنی ہی ہے مام! تو پھر ابھی کیوں نہیں۔"

حذیفہ دیوار کے ساتھ رکھے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"مام! میں جویریہ کو گھر لے کر آنا چاہتا ہوں۔"

اسمارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹی رہیں۔

"مجھ سے اجازت لے رہے ہو یا مجھے بتا رہے ہو؟"

جب حذیفہ کو لگنے لگا کہ وہ جواب دیں گی ہی نہیں تب انہوں نے اچانک آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" حذیفہ نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں' پھر بولیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ سارے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے لگو اور اب مجھے تم سے کسی بھی قسم کی توقعات وابستہ نہ کرنے کی عادت ڈال لینی چاہیے' کیونکہ نہ تو تمہیں میرے مشوروں کی اب ضرورت ہے نہ ہی میری اجازت کی فکر۔" اسمارہ نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہوتی تو جویریہ بہت پہلے اس گھر میں آ چکی ہوتی۔ آپ کا کہا اب بھی میرے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"تو میرے کہنے پر اس قصے کو ختم نہیں کر سکتے کیا؟" اسمارہ نے ایک دم سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حذیفہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی

لیے۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میں بہت زیادہ انوالو ہو چکا ہوں۔ اس مقام پر آچکا ہوں جہاں سے پلٹنا ناممکن ہوتا ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

"تو پھر میرے پاس بیٹھ کر اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ جاؤ! جا کرلے آؤ اسے۔ لیکن مجھ سے اسے خوش آمدید کہنے کی امید مت رکھنا۔"

انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے وہ پھر سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

حذیفہ کو احساس ہوا کہ اس کے اور اس کی ماں کے درمیان ایسی خلیج حائل ہو چکی ہے جسے پاٹنا مشکل ہے۔

اس نے بے چارگی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وہ اس معاملے کو سلجھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ لوگ جو چاہتے تھے' وہ حذیفہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جویریہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

حذیفہ پلنگ کے پاس کھڑا ہو کر کچھ دیر اسمارہ کو دیکھتا رہا مگر لیٹی ہوئی اسمارہ کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ شاید وہ واقعی سو چکی تھیں۔

پھر وہ چپ چاپ دروازے کی طرف مڑ گیا۔

اسمارہ نے حذیفہ کے اٹھ کر جانے کی آواز سنی پر انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

پر نیند اسمارہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے میز پر رکھے شاپروں میں سے ڈبل روٹی' انڈے وغیرہ نکالے جو وہ شام میں پاس کی دکان سے لے کر آئی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی طرح دو چار دن کا ہی سامان لا کر گزارا کر رہی تھی کیونکہ اسے نہیں پتا تھا کہ یہاں اس کے پڑاؤ کی اور کتنی مدت باقی ہے۔ سب حذیفہ پر منحصر تھا۔ وہ جب لینے آجاتا جویریہ ساتھ چل پڑتی۔

حذیفہ کے جانے کے بعد سے جویریہ سارے گھر میں بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔ جاتے وقت حذیفہ جلد واپس آنے کا وعدہ نہ کر گیا ہوتا تو اس کا یہاں رہنا مشکل ہوتا۔

لیکن جلد آنے کے وعدے کے باوجود حذیفہ نے ابھی تک آنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سے پوچھنے میں جویریہ کو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اپنے مرحوم باپ کے چھوڑے اثاثوں اور اپنی بیمار ماں کو سنبھالنے میں وہ کتنا مصروف ہو گا جو آنے کا وقت نہیں نکال پا رہا۔

یہی سوچ کر جویریہ ہر بار دل میں اٹھنے والے سوالوں کو دل میں ہی دبا لیتی تھی۔

جویریہ نے کچن میں جاتے ہوئے میز پر رکھے فون کی طرف حسرت سے دیکھا جو صبح سے ڈیڈ پڑا تھا۔ اس کے اور حذیفہ کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ بھی وقتی طور پر بند تھا۔

اس نے سوچا' وہ جلد ہی موبائل فون لے لے گی۔ یہ کتنا ضروری ہے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔

گرمی کا زور بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر آنے والا دن پہلے سے زیادہ تپش اپنے ساتھ لے کر آتا تھا۔ پچھلے سات آٹھ دنوں سے اس قدر حبس تھا کہ سانس لینا بھی دشوار لگنے لگا تھا درخت اور پودے اتنے ساکت تھے کہ جاندار' پھلنے پھولنے والی چیز کے بجائے کسی بے جان تصویر کا حصہ لگنے لگے تھے' جس میں رنگ تو ہوں مگر حرکت کی طاقت نہ ہو۔

پر آج شام کے وقت کہیں سے بہت سارے بادل آسمان پر ٹولیوں کی شکل میں نمودار ہوئے اور پیاسی دھرتی کے سیراب ہونے کی کچھ امید دکھائی دی۔

جویریہ اشیا کو ان کی مخصوص جگہوں پر سمیٹ کر رکھ رہی تھی جب پانی کے موٹے موٹے قطروں نے گلی کے کچھ گھروں کے دروازوں کے اوپر بنی ٹین کی چھتوں پر گر کر بارش کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔

جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر باورچی خانے کی چھوٹی سی کھڑکی کو بند کیا جس کے ذریعے تیز بوچھاڑ اندر آکر سارے باورچی خانے کو گیلا کر دیتی تھی۔

جویریہ کھڑکی بند کر کے مڑی تو گھر میں پھیلے گھپ اندھیرے نے استقبال کیا۔ بیٹھک کا وہ بڑا سا بلب جو جویریہ نے تھوڑی دیر پہلے جلایا تھا' بجھ کر بجلی چلی جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

جویریہ نے وہیں کچن کی ایک دراز سے موم بتی نکال کر روشن کی تو اسے یاد آیا کہ اس نے بیرونی دروازے کو ابھی تک تالا نہیں لگایا تھا۔ عموماً" یہ کام وہ سرِ شام ہی کر لیا کرتی تھی' آج جانے کیسے چوک گئی۔ واپس جا کر دروازے کو اچھی طرح سے بند کر لینے کے بعد جویریہ پلٹی تو اسے بیٹھک میں رکھے صوفے کے پاس ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔

دہشت کے مارے جویریہ کے ہاتھ سے موم بتی گرتے گرتے بچی۔ ہیولا تھوڑا آگے بڑھا اور موم بتی کی مدھم سی روشنی نے اس ہیولے کو مختار کی شکل و صورت عطا کی۔

"مختار چچا! آپ؟" جویریہ کی رکی سانسیں بحال ہوئیں۔

"ڈر گئیں کیا؟"

"اب اگر اندھیرے میں کوئی اچانک سامنے آئے تو ڈر تو لگے گا ہی۔" جویریہ کو مختار کا سوال عجیب سا لگا پر اس نے جتایا نہیں۔

جویریہ کو مختار سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا' پر اس وقت موم بتی کی لرزتی لو میں مختار کی خود پر جمی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اسے بے اختیار خوف محسوس ہوا۔

"چچا! آپ صبح آجایئے گا۔ اس وقت خاصی رات ہو چکی ہے۔" جویریہ نے اپنا لہجہ مضبوط رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھے چچا کس حساب سے کہتی ہو؟ میں تمہارا چچا تو نہیں ہوں۔" مختار بولا۔

"میں نے تو ہمیشہ آپ کو چچا کہا ہے۔" جویریہ نے اس کی انوکھی بات پر سٹپٹا کر کہا۔

"تو یہ تو تمہاری غلطی ہوئی نا۔" وہ بولا۔

وہ ابھی تک اسی جگہ پر کھڑا تھا اور اس کا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔

جویریہ کو مختار کی گفتگو ہی نہیں' اس کے انداز و اطوار بھی بدلے ہوئے لگے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ میرا مقروض تھا؟" مختار نے اچانک جویریہ سے سوال کیا۔

"جی.... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمام واجب رقم حذیفہ آپ کو جانے سے پہلے ہی ادا کر گئے تھے۔" جویریہ نے جواب دیا۔

مرنے سے ایک رات قبل ندیم صاحب نے حذیفہ کو پاس بٹھا کر اپنے ذمے تمام واجبات کی تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ حساب کتاب کوئی اتنا لمبا چوڑا نہیں تھا کچھ ان کا مان رکھنے کے لیے اور کچھ بحث سے بچنے کے لیے حذیفہ نے چپ چاپ سمجھ لیا۔ اس وقت حذیفہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان تمام ادائیگیوں کی ذمہ داری اسے سچ مچ نبھانی پڑے گی۔

"لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم ہو گا کہ میں نے تمہارے باپ سے رقم کے بدلے تمہارا ہاتھ مانگا تھا۔" مختار بولا تو جویریہ جھٹکا کھا گئی۔

ندیم صاحب نے اپنے آخری وقت میں اور سب کچھ تو حذیفہ کو سمجھا دیا مگر یہ انتہائی اہم بات بتانا بھول گئے یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے دانستہ اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہو' یہ سوچ کر کہ حذیفہ سے شادی ہو جانے کے بعد مختار کا مطالبہ از خود بے معنی ہو جائے گا اور بے معنی چیزوں کو زیرِ بحث لا کر وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟

پر انہوں نے جو بھی سوچا' غلط سوچا۔

کیونکہ رات گئے اس نیم اندھیرے گھر میں مختار سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر کھڑی جویریہ کو اس کی آنکھوں میں اپنے مطالبے سے دستبرداری نہیں' بلکہ کچھ اور ہی نظر آیا۔

"میں نے تو عزت دار طریقہ اپنانے کی کوشش کی تھی' مگر تمہارے باپ کو منظور نہیں تھا۔ خواہ مخواہ انکار کیے جا رہا تھا۔ آخر تنگ پڑ گیا میں اس کی بے کار کی حجت سے۔ دو دن کا وقت دیا تھا میں نے اسے اور کہا تھا کہ اگر ان دو دنوں کے اندر اس نے ہاں نہ کی تو میں

بھی شرافت کا دامن چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اپنانے پر مجبور ہو جاؤں گا کیونکہ جو چیز مجھے چاہیے ہوتی ہے' وہ میں کسی بھی قیمت پر حاصل کر کے ہی رہتا ہوں۔ اس کے بعد جانتی ہو تمہارے باپ نے کیا کیا؟"

مختار نے دم سادھے کھڑی جویریہ سے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"اس نے دو دن کی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی تمہارا نکاح اس لڑکے کے ساتھ کروا دیا اور میں۔"

مختار اپنی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"اپنے آپ کو ہوشیار سمجھنے والا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف منہ دیکھتا رہ گیا۔ بہت کائیاں آدمی تھا تمہارا باپ جو مجھ جیسے بندے کے ساتھ بھی اتنا بڑا ہاتھ کر گیا۔"

مختار کے اندر دبا ہوا سارا غصہ اب باہر آ رہا تھا اور اس کے سامنے کھڑی جویریہ کا خوف کے مارے خون خشک ہو رہا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں کے دوران گزرنے والے واقعات جویریہ کو اب سمجھ میں آ رہے تھے۔ ندیم صاحب کی تیزی سے گرتی صحت' ان کی بار بار بگڑ جانے والی طبیعت جسے وہ اپنی نا سمجھی اور لاعلمی کی بدولت جسمانی بیماری کے کھاتے میں ڈالتی رہی' دراصل اس ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھی جو مختار کا پیدا کردہ تھا۔

"یہ سب بے کار کی باتیں ہیں جن کو دہرانے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر آپ یہی سب کہنے کے لیے آئے تھے تو برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیے۔"

جویریہ اتنی نڈر ہرگز نہیں تھی' جتنا دکھائی دینے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ اسے تو اس وقت یہ سوچ کر بھی رونا آ رہا تھا کہ مختار کے چہرے کی خباثت اسے پہلے کیوں نہ نظر آئی۔ نیت کا فتور آج سے قبل کیوں نہ محسوس ہوا۔

وہ نہایت بے وقوف تھی۔ دوسروں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر لینے والی کم عقل لڑکی۔

"آپ نے سنا نہیں' میں نے کیا کہا۔ آپ پلیز! اس وقت یہاں سے چلے جائیے۔"

مختار کو وہیں جما کھڑا دیکھ کر جویریہ نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔

"اگر جانا ہی ہوتا تو میں یہاں آتا ہی کیوں؟" مختار عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟" خوف کی ایک شدید لہر جویریہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناتی ہوئی اوپر سے نیچے تک گئی۔

"میں نے کہا نا کہ جو مجھے چاہیے وہ میں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتا ہوں۔" مختار نے اپنا قدم آگے بڑھایا تو جویریہ بے اختیار پیچھے ہوتی ہوئی بند دروازے سے جا لگی۔

مختار کی آنکھیں ایک ایسے خونخوار جانور کی آنکھیں بن چکی تھیں جسے اپنا شکار اپنے سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے۔

"تمہارے باپ نے تمہاری شادی تو کروا دی لیکن یہ شادی مختار کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔ اب جب تمہارا شوہر تمہیں لینے کے لیے آئے گا تو اسے برتی ہوئی دلہن ملے گی۔"

مختار یہ کہہ کر دروازے کے ساتھ لگ کر سہمی کھڑی ہوئی جویریہ کو دبوچنے کے لیے سرعت سے آگے بڑھا۔

دونوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا جو سیکنڈوں میں پار ہو جاتا۔ جویریہ اتنی دیر میں دروازے کا وہ تالا کھول کر باہر نہیں نکل سکتی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔

جویریہ نے وہی کیا جو وہ کر سکتی تھی۔

اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے درمیان سے ہٹ جانے کی وجہ سے اس کی طرف تیزی سے آتا ہوا مختار سیدھا دروازے کو جا لگا۔

درد کی کراہ کے ساتھ مختار کے منہ سے جویریہ کے لیے ایک گندی گالی بھی نکلی جسے سننے کے لیے جویریہ رکی نہیں۔ وہ اندھا دھند اندر کو دوڑی۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ گھپ اندھیرے میں بھی اسے اندازہ تھا کہ کون سا دروازہ کہاں ہے۔ جویریہ نے ایک

کمرے کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا مگر اسے معلوم تھا کہ دروازے پر لگی معمولی سی چٹخنی مختار جیسے آدمی کو زیادہ دیر باہر رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پائے گی۔

جویریہ نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرے میں ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جویریہ کو پتا تھا کہ وہ اس وقت ندیم صاحب کے کمرے میں ہے۔ اس کے دائیں طرف مہمانوں کو بٹھانے والی کرسی تھی اور سامنے ندیم صاحب کا بستر اور بستر کے پیچھے کھڑکی جو پچھلی گلی میں کھلتی تھی۔

جویریہ تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے مختار کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اس بند کمرے میں محفوظ ہو گئی ہو؟ تمہاری اس غلط فہمی کو میں ابھی دور کیے دیتا ہوں۔"

جویریہ کو دروازے کے دوسری طرف سے مختار کے کہے الفاظ سنائی دیے۔ ساتھ ہی دروازے کے ساتھ کسی بھاری وجود کے ٹکرانے کی زوردار آواز بھی۔

دروازے پر لگی چٹخنی ان زوردار ٹکروں کے آگے ایک یا ڈیڑھ منٹ سے زیادہ ٹکنے والی نہیں تھی۔

جویریہ نے پوری قوت لگا کر کھڑکی کی کنڈی کھولنے کی کوشش کی مگر کنڈی زنگ لگ جانے کی وجہ سے ایک جگہ پر اٹک سی گئی تھی۔ جویریہ پاگلوں کی طرح اس سے زور آزمائی کرنے لگی۔

دروازے کی طرف سے دھاڑ دھم کی آوازیں متواتر آ رہی تھیں۔ دو لوگ دو مختلف راستوں کو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مختار کمرے کے اندر آنے کا راستہ اور جویریہ کمرے سے باہر جانے کا راستہ۔

بالآخر ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کنڈی کھل گئی۔ جویریہ نے کھڑکی کے دونوں پٹ وا کیے اور اس کے اوپر چڑھ گئی۔

کھڑکی گلی سے پانچ یا چھ فٹ کی اونچائی پر تھی۔ پر

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اُردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو / ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری / ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

اس وقت یہ اونچائی بیس فٹ بھی ہوتی تو جویریہ بلا جھجک کود جاتی۔

کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور مختار لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔

ساتھ ہی جویریہ نے باہر چھلانگ لگادی۔

ہلکی پھلکی بوچھاڑ اب تیز بارش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد بجلی کڑکنے کی زوردار آواز دل کو دہلا رہی تھی۔

جویریہ اپنے نزدیک ترین دروازے کو ہاتھوں سے پیٹنے لگی، مگر ٹین کی چھتوں پر شور مچا کر گرتے بارش کے پانی اور گرجتے بادلوں کی آواز نے اس کی پکار کو دبا ڈالا۔

جویریہ زار و قطار روتے ہوئے پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹے جارہی تھی۔ مختار اس کے سر پر پہنچ دکا تھا۔

جب جویریہ کو لگا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو گھر کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور آگے کو گرتی جویریہ "ہیں ہیں" کرتی بتول خالہ کی بانہوں میں جھول گئی۔

"اے ہے، ہمت تو دیکھو اس ناس پیٹے کی۔ سوچا ہوگا، اکیلی لڑکی ہے۔ کوئی والی وارث نہیں جو چاہے کرو۔ مرن جوگا کہیں کا۔" خالہ بتول خوب غصے سے بول رہی تھیں۔

"ارے اس بدمعاش کے کرتوتوں سے تو سارا محلّہ واقف ہے۔ اللہ بخشے تمہارے ابا مرحوم ہی کا ظرف تھا کہ برے سے برے انسان میں بھی اچھائی تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پر کیا فائدہ ہوا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ کم بخت اُن ہی کی عزت پر ڈاکا ڈالنے پہنچ گیا۔"

خالہ اپنی پالتو بلی کے پیالے میں دودھ ڈالنے کے ساتھ ساتھ مختار کو کوس رہی تھیں۔

جویریہ چپ چاپ دودھ کے پیالے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

خالہ بتول کا گھر گلی کا آخری گھر تھا۔ کچھ وہ زبان کی بھی ذرا کڑوی تھیں۔ محلے والوں سے زیادہ بنتی نہیں تھی۔ بہو بھی اتفاق سے تنگ مزاج ملی جو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اکلوتے بیٹے کو لے کر الگ ہوگئی۔ نہ خود ملنے آتی تھی، نہ ہی بچوں کو دادی سے زیادہ ملنے دیتی تھی۔ خالہ کا بیٹا ہی دس پندرہ دن کے بعد چکر لگا کر اور تھوڑا خرچا پانی ماں کے ہاتھ میں دے کر بیٹا ہونے کا فرض ادا کر جاتا تھا۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ منیر ملنے آیا ہوا تھا۔ بارش کی وجہ سے رات ٹھہر گیا۔ مرد کو گھر کے اندر دیکھ کر وہ خبیث الٹے پیر بھاگ گیا۔ اکیلی میں اور تم ہوتیں تو اس شیطان کو بھلا کیا روک پاتیں؟" خالہ نے جویریہ سے کہا۔

"بھئی! میں تو خدا لگتی کہوں گی۔ اس سارے قصے میں قصور تمہارا خود کا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو جوان جہان لڑکی کا اکیلے گھر میں رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پر تم آج کل کے بچے، نہ تو حالات کی نزاکتوں کو سمجھتے ہو، نہ ہی معاشرے کے رائج کردہ اصولوں کو کوئی اہمیت دیتے ہو۔ نتیجہ خود ہی دیکھ لو۔"

خالہ جویریہ کو کھری کھری سنا رہی تھیں پر اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ خالہ کی باتیں جویریہ کو سو فیصد درست لگ رہی تھیں۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اگر خالہ کا دروازہ وقت پر نہ کھلتا یا بارش کی وجہ سے خالہ کا بیٹا منیر ان کے گھر رات گزارنے نہ ٹھہر گیا ہوتا تو اس کا کیا بنتا۔ منیر کی للکار پر مختار وڑائچ پلٹ کر گلی سے نکلتا ہوا کچے میدان کی طرف بھاگ گیا تھا۔

خالہ بتول لاکھ زبان کی کڑوی سہی پر رات وہ اور ان کا بیٹا جویریہ کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔

"اب میری مان تو یہاں بیٹھ کر اس لڑکے کا انتظار کرنا بند کردے۔ وہ نہیں آسکتا تو تو اس کے پاس چلی جا۔ آخر منکوحہ ہے اس کی۔ اتنا تو تیرا حق بنتا ہے۔ گھر جا کر تھوڑا بہت جو ضروری سامان اکٹھا کرنا ہے، کرلے اور جا۔ کب تک تیرے میرے آسرے پر یہاں بیٹھی رہے گی۔"

خالہ نے جویریہ سے کہا جو ڈر کے مارے رات بھر سے اپنے گھر واپس لوٹ کر ہی نہیں گئی تھی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ منیر ساتھ ہے نا۔"

خالہ نے باہر برآمدے میں بیٹھ کر ناشتا کرتے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے بھی آج لاہور جانا ہے۔ تجھے تیرے میاں کے گھر تک چھوڑ آئے گا۔"

خالہ اس وقت مہربانی کے موڈ میں تھیں یا پھر جویریہ کی حالت دیکھ کر انہیں واقعی ترس آرہا تھا۔

"اور سن!" خالہ نے بلی کے خالی کیے پیالے کو پیر سے ایک طرف کرتے ہوئے جویریہ سے کہا۔

"رات والے قصے کا ذکر کسی سے نہ ہی کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ عزت بچ گئی۔ یہی غنیمت ہے۔ بات پھیلے گی تو تیرا ہی نقصان ہوگا۔ چار دن ہوئے نکاح کو، تیرے میاں کو اس بات کی خبر ہوگئی تو خدا جانے کیا سمجھے۔ یاد رکھ! مرد کی ذات کان کی کچی ہوتی ہے۔"

خالہ نے جویریہ کو بڑے پتے کی بات بتائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ نے چلتی گاڑی کے اندر سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالی۔

تیزی کے ساتھ گزرنے والے درخت اور پودے، یہاں تک کہ سڑک کے کنارے چلنے والے انسان بھی سارے دن کی دھوپ میں جھلسنے کے بعد اب سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دن ڈھلنے کا وقت قریب تھا۔ پھر بھی گرمی کی شدت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔

اسمارہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی رعنا نہ جانے کیا بات کر رہی تھیں۔ وہ "ہوں ہاں" کر رہی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ اعلا طبقے کا حصہ ہونے کے باوجود اسمارہ کے اندر ایک روایتی عورت چھپی ہوئی تھی جو شوہر کی عدم موجودگی میں خود کو بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگتی ہے، مگر اسمارہ کی فی الوقت پریشانی کا سبب دانش نہیں، حذیفہ تھا۔ دانش کی موت پر اسمارہ صبر کر چکی تھیں، کیونکہ صبر کرنے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

پر جو کچھ حذیفہ کرنے جا رہا تھا، اس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر ڈالی تھی۔

رعنا کو بھی جب پتا چلا تھا کہ حذیفہ اس لڑکی کو لینے چلا گیا ہے تو وہ بہت آگ بگولہ ہوئیں۔

"تمہیں حذیفہ کو صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ اس لڑکی کے لیے تمہارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

رعنا نے سخت غصے کے عالم میں اسمارہ سے کہا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس لڑکی کو یہاں لے کر آنے کی بجائے کہیں اور لے جاتا، پھر میں اور آپ کیا کرلیتے؟" اسمارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تو رعنا جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔

رعنا کے مقابلے میں اسمارہ اس موقع پر زیادہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

حذیفہ ضدی طبیعت کا نہیں تھا۔ عرشی کی طرح بے جا اور فضول باتوں پر اڑ جانے کی عادت بھی اسے نہیں تھی، لیکن ایک ماں ہونے کے ناتے اسمارہ کو اپنے بیٹے کے بارے میں اتنا ضرور پتا تھا کہ وہ اپنے ارادے کا پکا ہے۔ جس کام کو کرنے کی ایک بار ٹھان لے، اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

اسمارہ نے تھک کر گاڑی کی کھڑکی کے ساتھ اپنا ماتھا ٹیکا۔ رعنا بھی اسمارہ کی بے توجہی محسوس کر کے خاموش ہو چکی تھیں۔

"حنیف! ذرا گاڑی روکنا۔"

گاڑی گھر کے آہنی دروازے سے اندر داخل ہونے کو تھی جب اسمارہ نے ڈرائیور سے اسے روکنے کو کہا۔

"کیا ہوا؟" رعنا نے پوچھا۔

مگر اسمارہ کا دھیان رعنا کی طرف نہیں تھا۔ وہ نیلے پرنٹ والے لان کے سوٹ میں ملبوس لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو گیٹ کے پاس چوکیدار کے برابر کھڑی تھی۔

اسمارہ نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مگر ان کی چھٹی حس ان سے کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکی جویریہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سوفیہ نوید

عہدِ وفا

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی، اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لندن میں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جوریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جوریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جوریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جوریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جوریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا تو وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جوریہ کی ماں ایک بڑی زمیندار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جوریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی۔ جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جوریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جوریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جوریہ کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جوریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جوریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد اپنے کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر جاتا ہے تو راستے میں جوریہ سے ملنے کے لیے راہوالی اتر جاتا ہے۔ وہاں

ناولٹ

ندیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ حذیفہ انہیں اسپتال لے کر جاتا ہے۔ وہ جویریہ کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ اوباش عمر اور عیاش مختار و ڈانگی جویریہ کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ ندیم صاحب حذیفہ کی رضامندی سے ایمرجنسی میں حذیفہ اور جویریہ کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ حذیفہ اپنے باپ دانش کو آگاہ کرتا ہے۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں مگر اچانک انتقال کر جاتے ہیں۔ حذیفہ، جویریہ کو راہوالی چھوڑ کر لندن سے دانش کی میت لاتا ہے اور اسماء کو شادی کا بتاتا ہے۔ اسماء اور رعنا بہت خفا ہوتی ہیں۔ عرشی نیم پاگل ہو جاتی ہے۔

مختار وڈانگی حذیفہ کی غیر موجودگی میں جویریہ پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے۔ وہ عزت بچا کر جمیلہ خالہ کے گھر پناہ لیتی ہے۔ جمیلہ خالہ کا بیٹا منیر جویریہ کو لاہور میں حذیفہ کے گھر لے کر آتا ہے۔

تیسری قسط

"یہ لڑکی کون ہے خان؟" اسماء نے گاڑی کا شیشہ اتارتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ آج اسماء کے دروازے پر بھی ایک مسکین و لاوارث قسم کی لڑکی کو کھڑا دیکھ کر رعنا کے اندر کی سوشل ورکر بھڑک اٹھی۔

"اس کو چھوٹے صاب (حذیفہ) سے ملنا ہے۔ ام بتایا وہ گھر پر نہیں اے۔" گل خان نے بتایا۔

اسماء گاڑی سے اتر آئیں۔ چوکیدار کے برابر کھڑی لڑکی اور اس کے پیچھے کھڑے شلوار قمیص میں ملبوس گاؤدی قسم کے آدمی کو سر سے پیر تک تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

"کون ہو تم؟ حذیفہ سے کیا کام ہے تمہیں؟" رعنا بھی اسماء کی تقلید میں گاڑی سے اتر آئیں۔

"میرا نام جویریہ ہے، میں راہوالی سے آئی ہوں۔" جویریہ نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا۔

اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ پچھلے دس منٹ اس نے اس گرمی میں ایک ایسے چوکیدار کے ساتھ مغز ماری کرنے میں گزارے تھے جسے اتنے سالوں کی نوکری میں اندازہ ہو چکا تھا کہ کس بیلے کے مہمانوں کو بلا روک ٹوک اندر جانے کی اجازت ہوتی ہے اور کون سے لوگوں کو دروازے پر ہی ٹھہرا کر پوچھ گچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

"ہیں، جویریہ؟" رعنا نام سن کر چونک گئیں۔

"اسماء کیسں ہیں۔" وہ اس لڑکی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے اچھے بھلے گھر کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

رعنا نے سر سے پیر تک جویریہ کو گھور کر دیکھا جو نڈھال کھڑی تھی۔

اس کے پیروں میں سستی سی ربڑ کی چپل تھی جسے رعنا گھر میں بھی پہننا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"حذیفہ نے ساری دنیا چھوڑ کر چنا بھی تو آخر کس کو چنا؟" رعنا نے ناگواری کے ساتھ سوچا۔ اسماء کو بھی اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ مانا کہ لڑکی شکل و صورت کی بری نہیں تھی، لیکن حذیفہ شکل و صورت پر فریفتہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھ کر اسماء کو واقعی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس میں آخر ایسا کیا ہے جو ان کا بیٹا کسی صورت اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہو رہا۔

"تمہیں معلوم ہو چکا ہے نا کہ حذیفہ گھر پر نہیں ہے پھر بھی آنا۔" اسماء کا لہجہ ایسا تھا جو دروازے پر آنے والے کسی سوالی سے ہوتا ہے۔ بے زاری اسماء کے چہرے اور انداز دونوں سے عیاں تھی۔

اسماء کی بات پر جویریہ کی رگ و جاں میں رچی بسی تھکن میں ایک دم سے کئی گنا کا اضافہ ہو گیا۔

"شاید حذیفہ نے آپ کو میرے بارے میں بتایا نہیں ہے۔"

"بتایا تھا اس نے تمہارے بارے میں۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس کی وہ غلطی ہو جس کا وہ نادانی میں ارتکاب کر بیٹھا ہے۔" رعنا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

رعنا کے الفاظ پر جویریہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں کوئی غلطی نہیں، حذیفہ کی بیوی ہوں، ہماری شادی ہو چکی ہے۔" جویریہ نے کانپتے لبوں کے ساتھ رعنا کی تصحیح کی۔

"شادی۔ اچھا مذاق ہے۔" رعنا استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ "مان گئے تمہاری صلاحیتوں کو، اپنے حسن و جوانی کو کتنی مہارت سے استعمال میں لا کر تم نے حذیفہ کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسایا تھا، واہ۔"

رعنا نے تنفر سے کہا تو جویریہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

اتنا رکیک الزام۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں، میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ رو ہی تو پڑی تھی۔

"ہوں۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ میں ہی تمہیں ٹھیک سمجھی ہوں۔ میں چاہوں تو تمہیں اسی وقت پولیس کے حوالے کر دوں۔ تم پر دو منٹ میں اتنے کیس بنوا دوں کہ تمہاری ساری عمر سزا بھگتنے میں نکل جائے، مگر تمہاری کم سنی پر ترس آرہا ہے، اس لیے صرف تنبیہہ کر رہی ہوں کہ حذیفہ کی جان چھوڑ دو اور جا کر کوئی دوسرا شکار تلاش کرو۔ حذیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ تم سے جڑے ہر تعلق کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ ویسے بھی اس کی شادی میری بیٹی کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو، میں اس کے بدلے تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔" رعنا نے رعونت سے کہا۔

جویریہ سکتے کے عالم میں رعنا کو تک رہی تھی۔ اس کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی لرزش کو روکنے کے لیے انہیں ایک دوسرے میں اتنی زور سے پیوست کیا کہ ہاتھوں کی پشت پر نیلگوں رگیں نمایاں ہو گئیں۔

"مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف حذیفہ سے ملنا ہے۔ اگر اس نے کہا کہ وہ واقعی مجھ سے تعلق ختم کرنا چاہتا ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی، لیکن آپ پلیز مجھے صرف ایک بار حذیفہ سے مل لینے دیجئے۔" جویریہ نے التجا کی۔

رعنا کو اپنی اتنی فراخ دلانہ پیش کش کے بعد اتنے صاف انکار کی توقع نہ تھی۔ وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئیں۔

"او بے وقوف لڑکی! میری اتنی باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر تم ہو کیا؟ اوقات دیکھی ہے اپنی؟ دو ٹکے کی لڑکی۔ گل خان اس کو یہاں سے دھکے دے کر دفع

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا کمپلیٹ انسائیکلوپیڈیا

قیمت -/750 روپے

کھانا خزانہ

قیمت -/250 روپے

-/800

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

کرو۔" رعنا نے تلملا کر گیٹ کے پاس کھڑے چوکیدار کو مخاطب کیا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ واقعی جویریہ کو اٹھوا کر نظروں سے دور پھنکوا دیں۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' یہ خود ہی چلی جائے گی۔" اسمارہ نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر سے کی جانے والی لعن طعن اب تک رعنا نے ہی کی تھی۔ اسمارہ ان کے برابر یوں خاموش کھڑی رہیں جیسے اس سارے قصے سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

حالانکہ سب سے گہرا تعلق تو ان ہی کا تھا۔

اسمارہ اور حذیفہ کے نقوش میں بہت زیادہ مشابہت نہیں تھی۔ حذیفہ نے خود ایک بار جویریہ کو بتایا تھا کہ وہ قدوقامت میں بالکل اپنے باپ جیسا دکھتا ہے۔ پھر بھی جویریہ اپنے سامنے کھڑی دونوں عورتوں کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ ان میں سے کون سی حذیفہ کی ماں ہے۔ ویسے ہی جیسے اسمارہ نے پہلی نظر میں ہی جویریہ کی شناخت کرلی تھی۔

"ایک بات دھیان سے سن لو لڑکی! یہ میرا گھر ہے اور میری مرضی کے بغیر تم اس گھر کے اندر قدم بھی نہیں رکھ سکتیں۔ تمہارا حذیفہ پر کتنا بھی کنٹرول کیوں نہ ہو' مگر میں حذیفہ کی ماں ہوں اور میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ دنیا کی کسی بھی لڑکی کو کبھی اپنی ماں پر فوقیت نہیں دے سکتا۔" اسمارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

فقط تھوڑی دیر پہلے اسمارہ نے رعنا کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حذیفہ کو اس لڑکی کو گھر میں لے کر آنے سے نہیں روک سکیں۔ وہ اتنے دن سے خود کو ایک ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کررہی تھیں۔ لیکن اس وقت اس لڑکی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر غم و غصے کی ایسی شدید لہر ان کے اندر ابھری جس نے ان کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

انہیں غصہ کس پر آرہا تھا؟

سامنے کھڑی لڑکی پر جو ان کے بیٹے کی پسند تھی؟

اپنے بیٹے کی ہٹ دھرمی پر جو ان کی بات ماننے پر راضی نہیں تھا؟

حالات پر' جنہوں نے انہیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا؟

یا پھر ان حالات کے سامنے اپنی بے بسی پر؟

یا پھر شاید ان تمام چیزوں پر؟

غصہ جس پر بھی تھا بہت شدید تھا اور ان کے اسی غصے نے اس وقت جویریہ پر گھر کے دروازے بند کر دیے۔

اسمارہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے جویریہ کو رعنا کی دی ہوئی دھمکیوں سے کہیں زیادہ خوف زدہ کردیا۔ اسے اپنی ہمت جواب دیتی محسوس ہوئی۔

"اگر آپ حذیفہ کو جانتی ہیں تو میں بھی اسے اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دے سکتا۔ چاہے وہ آپ ہوں یا میں۔"

جویریہ کی آنکھیں اور الفاظ دونوں ہی بھیگے ہوئے تھے مگر لہجہ مضبوط تھا۔

جویریہ کے اس یقین کے آگے تھوڑی دیر کے لیے اسمارہ بھی چپ رہ گئیں۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ زیادتی کون کررہا ہے اور کس کے ساتھ ہو رہی ہے' فی الحال تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم وہیں چلی جاؤ' جہاں سے آئی ہو' کیونکہ نہ تو ہمارے گھر میں اور نہ ہی ہماری زندگیوں میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

اسمارہ نے سختی کے ساتھ کہا تو اس انتہائی گرم سہ پہر کی ساری حدت جیسے اس ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی جہاں جویریہ کھڑی تھی۔ جویریہ آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کے ساتھ اس بڑے سے گھر کے باہر کھڑی رہ گئی جس کے اندر قدم رکھنے تک کی اجازت اسمارہ نے اسے نہیں دی تھی پھر بھلا حذیفہ کی زندگی میں شمولیت وہ

کیسے برداشت کرسکتی تھیں؟

آج ایک بار پھر اپنی ذات اور اپنی حیثیت کے غرور میں جکڑی دو امیر عورتوں نے جویریہ کو اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔

کچھ سال پہلے یہی کام اس کی اپنی ماں نے کیا تھا' اپنے اور جویریہ کے بیچ کسی رشتے کا لحاظ کیے بغیر۔

جویریہ کو اپنا آپ ایک بار پھر اس مقام پر کھڑا محسوس ہوا' جہاں وہ بارہ برس کی عمر میں کھڑی ہوئی تھی۔ بے قصور اور بے خطا ہوتے ہوئے بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے قاصر۔

جویریہ کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔

کئی سال پہلے ایک ایسے ہی موقع پر اس کے بابا نے آکر اس کو سہارا دیا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کی ہمت عطا کی تھی۔ آج پھر اسے اپنے بابا کے سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن بابا تو اسے حذیفہ کے حوالے کرکے گئے تھے۔ اس کا خیال رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کا وعدہ کرکے تو پھر حذیفہ کہاں تھا؟

"بہن! میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ اب یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" جویریہ کے ساتھ کھڑے منیر نے اپنے لہجے میں بردباری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جویریہ پر تو خدا جانے اثر ہوا یا نہیں' پر جب رعنا نے پولیس بلانے کی دھمکی دی تو منیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ رعنا واقعی پولیس کو بلالیتیں۔ وہ یہاں سے جویریہ کو لے کر جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے مختصر نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھا۔

جویریہ بے جان ہوتے قدموں کے ساتھ اس گھر کے دروازے سے پلٹی' جسے وہ اپنا سب سے محفوظ سائبان سمجھ کر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ آخر گئی کہاں؟" حذیفہ نے راہوالی سے واپس آکر شدید اضطراب کے عالم میں رعنا کو بتایا۔

"گھر کی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے' وہ لاہور آنے کے لیے نکلی تھی تو کوئی کچھ اور کہتا ہے۔ اگر وہ لاہور آنے کے لیے نکلی بھی تھی تو اب تک تو اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پھر آخر وہ گئی کہاں؟"

حذیفہ پریشان تھا۔

"مجھے اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے پہلے ہی اپنے ساتھ یہاں لے آتا تو یہ نوبت نہ آتی۔" حذیفہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ جویریہ کو راہوالی میں تنہا چھوڑ آنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ مگر دانش کی موت کی اچانک خبر نے اسے اس بری طرح سے جھنجوڑ دیا تھا کہ وقتی طور پر اس کے سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہوگئی تھیں۔

حذیفہ کو جویریہ کے لیے اتنا پریشان دیکھ کر رعنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"بہت خوب' اس لڑکی کی اتنی فکر اور ماں کا ذرا بھی خیال نہیں تمہیں؟ جس لڑکی کا صرف ذکر سن کر اسمارہ شدید ٹینشن کا شکار ہوجاتی ہے اسے اپنے گھر میں دندناتا ہوا دیکھتی تو کیا حالت ہوتی اس بے چاری کی؟"

رعنا نے تلملا کر کہا تو حذیفہ چپ ہوگیا۔ چہرے پر اب بھی کرب کے آثار تھے۔ یہ وہی بھانجا تھا جس کی ذرا سی تکلیف پر رعنا بے چین ہوجایا کرتی تھیں۔ آج انہیں اس سے ذرا بھی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک طرف حذیفہ کی ہٹ دھرمی' دوسری طرف عرشی کا دن بدن بڑھتا ہوا دیوانہ پن اور ان دونوں کے بیچ پھنسی رعنا کی جان۔

رات میں بھی ان کی عرشی کے ساتھ اسی موضوع کو لے کر اچھی خاصی بحث ہوگئی۔ رات جب رعنا اپنے بیڈ روم سے ملحق ڈریسنگ روم میں سے شب خوابی کا لباس پہن کر باہر نکلیں تو عرشی ان کے بستر کے کنارے موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ ان کے کمرے میں نیند کی گولیاں لینے آئی تھی جو رعنا کثرت سے استعمال

کرتی تھیں۔
رعنا کو تو خیر نیند نہ آنے کی بیماری کئی برسوں سے تھی مگر عرشی۔
عرشی کو نارسائی کا روگ لگ گیا تھا۔ دونوں ہی کی راتیں گولیوں کے بنا بے سکون گزرنے لگی تھیں۔
"یہ کیا ہے؟" عرشی نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ہوا میں لہرایا جو سائیڈ ٹیبل کی دراز سے گولیاں تلاش کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔
"سیل فون ہے۔" رعنا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔
"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے، مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"
"حذیفہ راہوالی جاتے وقت اسے گھر پر ہی بھول گیا تھا۔" رعنا نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"اور آپ اٹھا کر یہاں لے آئیں کیوں؟" عرشی نے پوچھا۔
"تاکہ وہ لڑکی اس سے فون پر بات نہ کرسکے۔" رعنا زچ ہوتے ہوئے بولیں۔
عرشی کچھ دیر رعنا کو دیکھتی رہی پھر بولی۔
"آپ کو کیا لگتا ہے کہ جس لڑکی کو حذیفہ نے اپنی زندگی میں شامل کرلیا ہے اسے اپنے گھر کے دوسرے فون نمبر نہیں دیے ہوں گے؟"
"تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" رعنا چڑ کر بولیں۔
"جو کچھ آپ کررہی ہیں وہی میرا سب سے بڑا پرابلم ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ اگر حذیفہ اپنا موبائل ساتھ لے جانا بھول گیا تو اسے ساری زندگی اپنا موبائل یاد ہی نہیں آئے گا؟ اگر آپ حذیفہ کی غیر موجودگی میں الٹے سیدھے جھوٹ بول کر اس لڑکی کو دروازے سے چلتا کردیں گی تو وہ کبھی دوبارہ واپس نہیں آئے گی؟ وہ ضرور واپس آئے گی اور ضروری نہیں ہے کہ اگلی بار بھی حذیفہ گھر پر موجود نہ ہو۔ اس طرح سے یہ معاملہ سلجھنے والا نہیں ہے، کوئی ٹھوس اور حتمی حل تلاش کیجیے اس مسئلے کا۔"
"کیا حل تلاش کروں؟ اس لڑکی کو اغوا کروا لوں یا پھر جان سے مروا دوں؟ کسی غیر قانونی گروہ کا سرغنہ سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟" رعنا بپھر کر بولیں۔ "جو کچھ میرے بس میں تھا میں نے کیا۔ اس لڑکی کو پیسوں کا لالچ تک دے کر دیکھ لیا۔ وہ ڈھیٹ تب بھی نہیں مانی۔ ظاہر ہے جب پورا سمندر نظروں کے سامنے ہو تو چند بوندیں لے کر کون پیچھے ہٹتا ہے؟"
رعنا نے زہرخند لہجے میں کہا۔ انہیں بھی اپنی ناکامیوں پر غصہ آرہا تھا۔ حذیفہ کا موبائل اٹھا لانا ایک اضطراری حرکت تھی جو انہوں نے بلا سوچے سمجھے کردی تھی ورنہ مسئلے کا ٹھوس اور حتمی حل تو ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح حذیفہ کا دل جویریہ سے پھیر دیا جاتا۔ مگر یہ رعنا کے بس کی بات نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ کو راہوالی سے آئے کتنے ہی دن ہوچکے تھے اور ابھی تک جویریہ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ وہ ہر اس جگہ پر جاکر اسے ڈھونڈ آیا جہاں اسے لگتا تھا کہ جویریہ جاسکتی ہے مگر وہ کہیں بھی نہ تھی۔ ان گزرے چند دنوں کے دوران حذیفہ اپنے اور جویریہ کے درمیان فون پر ہونے والی آخری گفتگو کو سیکڑوں بار اپنے ذہن میں دہرا چکا تھا۔ وہ روزانہ صبح شام ہونے والی بات چیت کی طرح بالکل عام سی گفتگو تھی۔ حذیفہ کو یہ بھی یاد تھا کہ راہوالی کے لیے نکلنے سے قبل آخری دن اس کی جویریہ سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ اس نے اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی مختار وڑائچ کے گھر فون کرکے دی تھی۔
حذیفہ نے مختار وڑائچ کے بارے میں سوچ کر جھرجھری لی، جس کی بارش کے دوران برساتی نالے میں گرنے سے موت واقع ہوگئی تھی۔ لاش چار دن تک نالے میں پانی کے ساتھ جمع ہونے والے گند اور غلاظت کے بیچ پھنسی رہی۔ بارشوں کے بعد جب

اس کا پانی کم ہوا تو لاش دریافت ہوئی، مگر تب تک اس کی اتنی بری حالت ہوچکی تھی کہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ جیب سے نکلنے والے شناختی کارڈ سے پتا چلا کہ مرنے والا بدنصیب کون تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ موسلادھار بارش کے دوران کیچڑ والی زمین پر پیر پھسل کر نالے میں گر جانا موت واقع ہوجانے کا سبب بنا تھا۔ مختار اتنی تیز و تند بارش کے موسم میں گھروں کے پیچھے کے میدان میں بہنے والے برساتی نالے کے پاس کیا کرنے گیا تھا، یہ محلے میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ خود حذیفہ کو مختار کے انجام کی تب خبر ہوئی جب وہ دوسری بار اس امید پر راہوالی گیا تھا کہ شاید جویریہ واپس لوٹ آئی ہو۔
پتا نہیں مختار کو اس کا پیغام جویریہ تک پہنچانے کا موقع بھی ملا تھا یا نہیں؟ حذیفہ نے شرٹ کا آخری بٹن بند کرتے ہوئے پولیس میں جویریہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کا سوچا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد اب یہی راستہ بچا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی گھڑی اٹھا کر کلائی میں پہنی اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر نکل آیا۔ سامنے اسمارہ کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اسمارہ ان دنوں اتنی دیر تک سونے لگی تھیں، جب تک کہ حذیفہ ناشتا کرکے گھر سے باہر نہیں چلا جاتا تھا۔ یہ عادت کچھ ہی دنوں سے اسمارہ نے اپنائی تھی۔
حذیفہ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل میں جانے کے لیے اسمارہ کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر سے رعنا کی آواز سنائی دی۔
رعنا کی اتنی صبح اسمارہ کے کمرے میں موجودگی پر تجسس ہو کر وہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔
اندر گھستے ہی اس کی نظر اسمارہ پر پڑی تھی جو پلنگ پر الٹی اکھڑی سانسیں لے رہی تھیں۔
"کیا ہوا؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"اسمارہ کی طبیعت خراب ہے۔ میں اسے اسپتال لے کر جارہی ہوں۔" اسمارہ کی بجائے رعنا نے جواب دیا۔ وہ اسمارہ کی حالت دیکھ کر گھبرائی ہوئی تھیں۔
حذیفہ نے ایک لمحے کے لیے ماں کے سفید چہرے پر سے نظر ہٹا کر رعنا کے متوحش چہرے پر نظر ڈالی، پھر بولا۔
"آپ مام کی رپورٹس پکڑیے، میں انہیں نیچے لے کر جاتا ہوں۔"
اسمارہ کو بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لے جاتے ہوئے حذیفہ کو احساس ہوا کہ اسمارہ کا وزن پچھلے چند دنوں میں خطرناک حد تک کم ہوچکا ہے۔
اسمارہ کو رعنا کے برابر پچھلی سیٹ پر بٹھا کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔
اسمارہ کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ حذیفہ کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اسمارہ نے چند منٹ کی دوری پر رہنے والی رعنا کو فون کرکے بلایا اور محض پندرہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
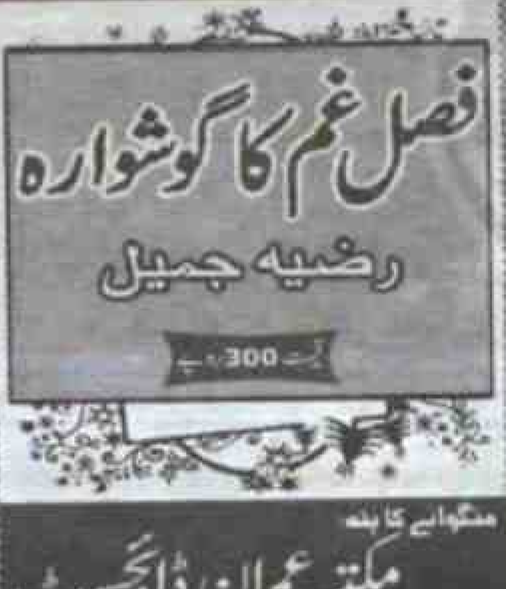

منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

سیکنڈ کے فاصلے پر دوسرے کمرے میں موجود حذیفہ کو آواز نہیں دی۔ وہ اس سے اتنی ناراض تھیں۔ اسٹیئرنگ پر حذیفہ کی گرفت ایک دم سے سخت ہو گئی۔

نہ جانے کتنی دیر اسپتال کی لمبی راہداری میں ٹہل کر گزارنے کے بعد حذیفہ آخر تھک کر وہیں رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

حذیفہ کے سامنے شیشے کی دیوار کے پار بنا کمرا سائنس کی ایجاد کردہ ایسی مشینوں سے بھرا تھا جو کسی بھی ایسے انسان کی سانسیں چلتی رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں جس کے اپنے خود کے اعضا اس کی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے احتراز برتنے لگے ہوں۔

آج کے بعد اسماء کو بھی ان ہی میں سے ایک تھم اسبل کے سہارے اپنی باقی ماندہ زندگی کو گزارنا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق اسماء کے گردوں کی کارکردگی دس فیصد سے بھی کم ہو چکی تھی۔ انہیں اب باقاعدگی کے ساتھ ڈائیلاسس کروانے کی ضرورت تھی۔

صوفے پر بیٹھے ہوئے حذیفہ نے اضطراری انداز میں سر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ کیا وہ واقعی اپنی ذاتی پریشانیوں اور الجھنوں میں گم ہو کر اتنا غافل ہو گیا تھا کہ ماں کی تیزی سے گرتی صحت کا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

رعنا اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی صبح سے یہیں تھیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں کی تھکن ان کے چہرے پر بھی رقم تھی۔

"اگر ماما کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" حذیفہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔" رعنا نے ترشی سے کہا۔ "اس وقت اس کی جو حالت ہے وہ اس ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے جو تمہاری ضد نے اسے بخشا ہے۔" رعنا نے تھوڑے توقف کے بعد یوں کہنا شروع کیا، جیسے پھر بھی نہ کہنے کا عہد کرنے کے باوجود وہ خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پا رہی ہوں۔

"اتنا بڑا قدم اٹھاتے وقت تمہیں اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا تمہاری ماں پر کیا اثر پڑے گا؟ تم اکلوتے بیٹے ہو اس کے۔ کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں گی اس نے تمہاری ذات سے۔ کیا ایک ماں کی حیثیت سے اس کا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے اس فیصلے میں وہ بھی شامل ہوپاتی یا اپنی رائے کا اظہار کر سکتی؟ کم از کم اس کے لوٹنے تک تو انتظار کیا ہوتا تم نے۔ اپنی ماں کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے تم؟"

رعنا نے کہا تو حذیفہ شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ رعنا درست کہہ رہی تھیں۔

"ماما کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔" اس نے کھلی ہوئی آواز میں کہا۔

"سوائے اس لڑکی کو چھوڑنے کے۔" رعنا تلخی سے بولیں۔ حذیفہ کے چہرے پر پھیلے کرب میں یک دم کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

"اگر اتنا بڑا فیصلہ بنا سوچے سمجھے کیا تو میں نے کیا، جلد بازی کی تو میں نے کی، جو بریہ تو خطاوار نہیں، پھر اسے اس کی سزا کیوں دی جائے؟" وہ بولا۔

ایسے موقع پر بھی کسی کے ساتھ زیادتی کر جانے کے احساس نے حذیفہ کو کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھا ہوا تھا۔

"ٹھیک کہا تھا اس لڑکی نے۔ حذیفہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ یہ اس کی سرشت میں ہی نہیں۔" رعنا نے سر جھکا کر سوچا تھا۔

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ وہ لڑکی اتنی معصوم اور بھولی بھالی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو تو؟"

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" حذیفہ نے حیران ہو کر رعنا کی شکل دیکھی۔ رعنا نے گہرا سانس لے کر خود کو وہ کہنے کے لیے تیار کیا جس پر عرشی کے مستقبل کا دارو مدار تھا۔

"تم نے ٹھیک سنا تھا۔ وہ لڑکی تمہارے راہ والی جانے کے بعد یہاں آئی تھی۔ تم سے ملنے نہیں، بلکہ

تم سے جڑے رشتے کی قیمت وصول کرنے جو ہم نے اسے دے دی۔ اب وہ واپس نہیں آئے گی کیونکہ اس کے پیروں میں نوٹوں کی زنجیریں پڑ چکی ہیں۔"

"یہ غلط ہے' جویریہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔" حذیفہ نے دبے دبے غصے کے ساتھ کہا۔

"تمہیں لگتا ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" رعنا نے پوچھا۔

"یہ آپ کو بہتر پتا ہو گا۔" وہ تنک کر بولا تو رعنا چپ ہو گئیں' پر وہ بھی اتنی جلدی ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہ تھیں۔

"اگر یہ غلط ہے تو پھر تم ہی بتاؤ کہ وہ اب تک لوٹ کر کیوں نہیں آئی؟ وہ تمہارے لیے گمشدہ ہے' تم تو اس کے لیے گمشدہ نہیں ہو' پھر اسے کیا چیز ہے جو اسے تم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے؟" رعنا کی اس بات پر حذیفہ کے چہرے پر پہلی بار تذبذب کے آثار نظر آئے۔

"میں نہیں مان سکتا۔ جویریہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔" حذیفہ نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔ مگر اس بار اس کے لہجے میں پہلے جیسا یقین نہیں تھا۔

"تمہیں کیا معلوم وہ کیسی لڑکی ہے' تم اس کے بارے میں جانتے ہی کتنا ہو؟ کتنے عرصے کی ملاقات ہے تمہاری اس سے؟ پھر بھی میری بات کا یقین نہیں کرنا چاہتے ہو تو مت کرو' لیکن تمہارے نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔"

رعنا خاموش ہو گئیں۔

وہ اپنا پتا پھینک چکی تھیں۔ بازی ان کے حق میں جاتی تھی یا نہیں' یہ اب قسمت پر منحصر تھا۔

"اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو آپ نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے رعنا سے پوچھا۔

"بتا دیتی تو کیا تم یقین کر لیتے؟" رعنا نے الٹا سوال کیا تو حذیفہ ایک بار پھر چپ ہو گیا۔

یقین تو اسے اب بھی نہیں تھا مگر حالات و واقعات جویریہ کے خلاف جا رہے تھے۔ اگر جویریہ واقعی حق پر تھی تو آ کر اپنا حق ثابت کیوں نہیں کر رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو حذیفہ' رعنا کی کہی باتوں پر دوسری بات سوچتا بھی نہیں' مگر اس وقت اسمارہ کی حالت کے پیش نظر دل میں ابھرنے والے احساس جرم کا پلڑا' نبھائے گئے وعدے کے پلڑے سے کہیں بھاری ہو چکا تھا۔

حذیفہ نے کچھ عرصہ پہلے اپنا باپ کھویا تھا۔ وہ باپ جس نے اس مشکل فیصلے میں اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اگر دل سے راضی نہ ہوتے تو کبھی اس معاملے میں حذیفہ کی معاونت کا اقرار نہ کرتے۔ یہ بات اچھی طرح سے جان لینے کے باوجود حذیفہ گزرے چند دنوں کے دوران خود کو یہ سوچنے سے باز نہیں رکھ پایا کہ کہیں اس کے باپ کی اچانک موت کے پیچھے بھی اس کے اٹھائے قدم کا ہاتھ تو نہیں ہے۔

لیکن اسمارہ کی اس وقت جو حالت تھی۔ اس کے پیچھے کسی نہ کسی حد تک حذیفہ کے اٹھائے قدم کا ہاتھ بھی ضرور تھا' یہ بات حذیفہ رعنا کے جتائے بنا بھی جانتا تھا۔

باپ کے بعد وہ اپنی ماں کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔

"پھر آپ ہی بتائیں' میں کیا کروں؟" اس نے رعنا کی طرف رخ کرتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

"اسمارہ کو اس کا بیٹا' اس کا غرور واپس لوٹا دو۔" رعنا نے کہا۔

"مگر کیسے؟"

"اس کی بات مان کر' اس کی خواہش کو پورا کر کے۔" رعنا بولیں۔ "تم عرشی سے شادی کر لو' اسمارہ یہی چاہتی ہے۔"

"لیکن۔۔۔" حذیفہ نے کچھ کہنا چاہا' پر رعنا نے کہنے کا موقع نہ دیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ تم اب بھی ایک ایسی لڑکی سے وفاداری نبھانے پر بضد ہو جس کے لیے تم دولت حاصل کرنے کے ذریعے کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ تمہارا دل اس لڑکی کی اصلیت کو جان لینے کے باوجود اسے ماننے کو تیار نہیں ہے' لیکن میری تم سے صرف ایک گزارش ہے'

ایک نظر اپنی ماں کے چہرے پر بھی ڈال کر دیکھو اور اس کی اذیت اور تکلیف کا اندازہ لگاؤ' پھر بولو کہ تمہارا اصل [illegible] ہے۔"

رعنا نے نرمی سے کہا تو حذیفہ نے شیشے کے پار دیکھا جہاں اسپتال کے مخصوص سفید کپڑوں میں ملبوس نرس اسمارہ کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

اسمارہ کا چہرہ زرد اور آنکھیں بند تھیں لیکن ایک چیز اتنے فاصلے سے بھی حذیفہ کو صاف دکھائی دے رہی تھی کہ اسمارہ نیند یا بیداری' جس بھی حالت میں تھیں' پرسکون ہرگز نہیں تھیں۔

ان کے چہرے کے خدوخال کے درمیان پچھلے چند دنوں میں جن پریشان کن لکیروں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کا بیماری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حذیفہ کے چہرے پر پھیلی فکر و تردد کی پرچھائیوں کو دیکھ کر رعنا کو اچانک چھ فٹ کے حذیفہ کی جگہ وہی دو سال کا بچہ نظر آنے لگا' جسے وہ تب اپنی پیاسی ممتا سیراب کرنے کے لیے گود میں لیے لیے پھرتی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے رعنا کا دل چاہا کہ اپنے سارے جھوٹ واپس لے لیں۔

پر وہ لمحہ گزر گیا۔

پیار کی محبت پر ایک بار پھر ان کی خود غرضی غالب آ گئی۔

"ٹھیک ہے خالہ' اگر ماما کی خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی۔ میں عرشی سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" حذیفہ نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو زندگی کبھی اتنی حسین نہیں لگی تھی جتنی اب لگ رہی تھی۔ اسے وہ شخص مل گیا تھا جسے پانے کی تمنا برسوں سے اس کے دل میں بسی تھی۔

حذیفہ بہت بہترین نہ سہی' پر کچھ ایسا برا شوہر بھی ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ عرشی کے ساتھ اس کے برتاؤ کو نامناسب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتا اور ہر ممکن حد تک اس کا خیال بھی رکھتا۔ پھر بھی اس کے رویے میں وہ چاہت یا خوشی جھلکتی دکھائی نہیں دیتی تھی جو ایک نو بیاہتا جوڑے کو ممتاز کر کے بھرے مجمع میں بھی اس کی شناخت کرا دیتی ہے۔

اپنی فتح کے نشے میں چور ہو کر عرشی کو اس کمی کا احساس نہ ہوا ہو' پر گھر کا ایک فرد ایسا ضرور تھا جسے یہ کمی بہت بری طرح سے کھٹکتی تھی۔

اور وہ تھیں اسمارہ۔

اسمارہ کو اب باقاعدگی سے اسپتال جانا پڑتا تھا۔ جس دن ان کو جانا ہوتا' اس دن حذیفہ اپنی تمام مصروفیات کو ترک کر کے انہیں خود لے کر جاتا' وہ اب ویسے ہی اسمارہ کا خیال رکھنے لگا تھا' جیسے وائش رکھا کرتے تھے' ہر پل' ہر وقت۔

حذیفہ عملی زندگی میں قدم رکھ کر گھر سے آفس اور آفس سے گھر کی بندھی روٹین میں جت گیا اور عرشی بھی ان سرگرمیوں میں پھر سے گم ہو گئی' جو شادی سے پہلے اسے مصروف رکھا کرتی تھیں۔

لیکن اسمارہ کو یہ ساری روٹین بہت عجیب لگنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوا تھا۔

رعنا نے ٹھیک کہا تھا اسمارہ یہی تو چاہتی تھیں' پھر کیا وجہ تھی کہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے یا رات کا کھانا کھاتے ہوئے یا پھر کسی بھی ایسے وقت جب وہ تینوں ایک جگہ پر اکٹھے موجود ہوتے تھے' ان کے درمیان گونجنے والی آواز صرف عرشی کے موبائل فون کی بیپ یا پھر اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو کی ہوتی۔ عرشی کی اس یکطرفہ بات چیت کے دوران وہاں موجود باقی کے دو فریقوں کے درمیان چھائی خاموشی کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔

کئی بار اسمارہ نے وحشت زدہ ہو کر اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی مگر توڑ نہیں پائیں۔

ایسا نہیں تھا کہ حذیفہ ان سے بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ اب بھی اسمارہ کی ہر بات کا جواب اتنی ہی عزت اور محبت کے ساتھ دیتا جتنا پہلے دیا کرتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اب وہ محض "جواب" ہی دیا کرتا تھا' عرشی کے اور اسمارہ کے پوچھے سوالوں یا ان کی کہی باتوں تک۔ اس کے پاس جیسے خود سے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

حذیفہ کی وہ بذلہ سنجی جو کبھی سارے گھر میں جان ڈال دیا کرتی تھی اب خاموشی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی شوخی پر سنجیدگی کا پردہ پڑ چکا تھا۔

حذیفہ نے ہمیشہ جو بھی محسوس کیا کھل کر کیا۔ کبھی بھی اپنی خوشی و انبساط یا پھر کسی اور دلی کیفیت کو کسی سے چھپا کر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی بولتی آنکھیں اس کے ہر جذبے عیاں کر دیا کرتی تھیں۔ اب اسمارہ کو اس کی آنکھوں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔

عرشی نے شاید اس کی اس تبدیلی کو ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا اور اگر کیا بھی تھا تو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

عرشی کا خیال تھا کہ حذیفہ کا یہ نیا روپ ایک فطری چیز ہے، جس کے لیے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اب حذیفہ کوئی نو عمر لڑکا نہیں رہا بلکہ ایک میچور شادی شدہ مرد ہے۔ زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آنے کے بعد شخصیت میں بدلاؤ آنا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں۔

یہ بدلاؤ عرشی کے لیے بھلے اہمیت نہ رکھتا ہو مگر اسمارہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ عرشی کوشش کرکے اس پرانے حذیفہ کو واپس لے آئے۔ آخر وہ حذیفہ کی بیوی تھی۔ اس سے بہتر طور پر اس کام کو کون سرانجام دے سکتا تھا۔

ایک بار جذبات کی رو میں آکر اسمارہ نے عرشی کو یہ سب سمجھانے کی بے کار سی کوشش بھی کی۔ حذیفہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بتانے، اس کی دن بھر کی مصروفیات میں دلچسپی دکھانے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان مصروفیات میں خود کو شامل کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

"جب حذیفہ کو میرے لائف اسٹائل پر اعتراض نہیں، نہ ہی اس کو میرے کہیں آنے جانے سے کوئی پرابلم ہے تو پھر آپ پابندیاں لگانے والی کون ہوتی ہیں۔ آپ خالہ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو اپنی زندگی میں دخل اندازی کی اجازت دے دوں گی۔"

عرشی نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا تو اسمارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

آخر عرشی کو انہوں نے اور رعنا نے ہی مل کر سر چڑھایا ہوا تھا۔ وہ اسے کچھ کہتیں بھی تو کیا کہتیں؟

شاید اس نئے رشتے کے رنگوں میں واقعی اتنا دم تھا جو پرانے رشتوں کے ہر رنگ پر چڑھ کر اسے بے رنگ کر رہا تھا۔

یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اسمارہ کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عرشی شادی کے بعد ایک بہترین بیوی کے روپ میں خود کو ڈھال دکھائے۔ اسمارہ یہ بھول چکی تھیں کہ شادی کے بعد خود کو شوہر کے پسندیدہ روپ میں ڈھالنے کا زمانہ اب بیت چکا ہے۔ اب کون کسی کے لیے اتنا تردد کرتا ہے اور پھر ان کے طبقے میں تو اس کا رواج ہی نہیں تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو قصور عرشی کا نہیں تھا۔ اسمارہ کے ہی گلے بے معنی تھے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حذیفہ کا پسندیدہ روپ کیا تھا؟ یہ کسے معلوم تھا۔ اس نے تو اپنی ذات کو پسند و ناپسند کے جھنجھٹ سے ہی آزاد کرا لیا تھا۔ اس کے لیے ہر چیز "بس ٹھیک ہے" کی حد تک رہ گئی۔ اچھا یا برا جیسے الفاظ اور ان کے معنی اس کے لیے اجنبی ہو چکے تھے۔

وہ تو جیسی گزر رہی تھی بس گزارے جا رہا تھا۔ اسمارہ کو اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ عرشی کو زندگی میں شامل کر لینے کے بعد حذیفہ کی تنہائیوں میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو گیا ہے اور سب سے زیادہ پریشان کن سوچ یہ تھی کہ اس کی ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ

آپ۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو اب اپنی تمام عمر اس مرض کے ساتھ گزارنی تھی۔ اس بات کے لیے حذیفہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ مگر باقاعدگی کے ساتھ ڈائیلاسس کروانے کے باوجود اسمارہ کی دن بدن گرتی صحت کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔

"ایک تو اسمارہ کے کیس میں کڈنی کے علاوہ چند اور میڈیکل مسئلے بھی ہیں جو ان کے کیس کو پیچیدہ کرتے ہیں اور دوسرا۔"

ڈاکٹر ناصر حذیفہ کو بتاتے بتاتے رک گئے۔

"اور دوسری چیز ہے اسمارہ کی مینٹل کنڈیشن۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ کسی بھی بیماری کے علاج میں آدھا کام ڈاکٹر کرتا ہے اور باقی کا آدھا کام خود مریض۔ مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری والدہ اپنے حصے کا کام نہیں کر رہی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں' آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

حذیفہ نے الجھ کر ان سے پوچھا۔

"مریض کی صحت یابی میں ایک بہت بڑا حصہ اس کی مثبت سوچ کا ہوتا ہے۔ تمہاری والدہ شدید ڈپریشن کا شکار ہیں۔ دانش کی جدائی نے ان کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ کچھ بھی کرکے انہیں اس ڈپریشن سے باہر نکالو۔ ان میں جینے کی امنگ پیدا کرو۔ ورنہ بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر ناصر نے کہا۔

"یہ میرے بس میں نہیں ہے انکل!" حذیفہ کے کاندھے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح جھک گئے۔

"میں سب کچھ کرکے دیکھ چکا ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی پوری زندگی ان کی خواہش اور مرضی کے تابع کر چکا ہوں۔ لیکن میں ڈیڈ کو واپس نہیں لا سکتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اسمارہ کو علاج کے لیے باہر لے جاؤ۔"

"اپنی تسلی کے لیے لے جانا چاہتے ہو تو بے شک لے جاؤ۔ میں تمہیں کچھ اچھے ڈاکٹروں کے ریفرنسز دے دیتا ہوں۔ تمہیں آسانی رہے گی۔" انہوں نے حذیفہ کے چہرے پر پھیلی فکر کو دیکھ کر نرمی سے کہا۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو باہر لے جانے کے انتظامات حذیفہ نے بہت تیزی کے ساتھ مکمل کیے تھے۔

باہر کے ڈاکٹروں نے بھی اسمارہ کی بگڑتی حالت کے بارے میں وہی کچھ کہا جو پاکستان میں ڈاکٹر ناصر نے کہا تھا۔ اسمارہ خود صحت مند نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ ان کا ڈپریشن ان کی شفایابی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

ڈاکٹر اور حذیفہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسمارہ کے ڈپریشن کی وجہ دانش کی اچانک موت ہی نہیں کچھ اور بھی ہے جو انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔

حذیفہ کو اس "کچھ اور" کے بارے میں اس دن علم ہوا جس دن اسمارہ نے حذیفہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کانپتی آواز میں اس سے معافی مانگی۔

"آپ کس بات کی معافی مانگ رہی ہیں؟" ان کے بستر کے ساتھ کرسی پر بیٹھے حذیفہ نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔

"تمہیں' تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے دور رکھنے کی معافی۔" اسمارہ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں خوش نہیں ہوں؟" حذیفہ اسمارہ کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ماں ہوں تمہاری۔ اتنا تو سمجھ سکتی ہوں۔"

"ہم انسان بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔ اپنی انا اور غرور میں ہمیں سامنے کی حقیقت نظر نہیں آتی اور جسے حقیقت سمجھتے ہیں وہ محض ایک سراب ہوتا ہے۔ ہمیں ہوش آتا ہے تو وقت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔"

اسمارہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھیں اور حذیفہ الجھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

"وہ تمہیں ڈھونڈتی گھر تک آئی تھی۔ میں نے اسے اندر ہی نہیں آنے دیا۔"

اسمارہ نے ہمت کر کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

اسمارہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھے ہوئے حذیفہ کا ہاتھ لمحہ بھر کو لرزا مگر اس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی۔

"اس وقت میں نے جو کچھ بھی کیا۔ یہ سوچ کر کیا کہ اسی میں تمہارا بھلا ہو گا۔ میرا عمل ضرور کھوٹا ہو گا مگر میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ بس یہی چیز دھیان میں رکھ کر اپنی ماں کو معاف کر دینا۔"

اسمارہ نے آنکھیں موند کر کہا تو دو آنسو ان کی آنکھوں کے کناروں سے پھسل کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

اسمارہ کو یاد آیا کہ بچپن میں حذیفہ جب کوئی کھلونا یا کوئی اور چیز پسند کرتا تھا تو وہ اسے رد کر کے اس کی توجہ مہنگی اور قیمتی شے کی طرف دلانے کی کوشش کرتی تھیں جبکہ دانش انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے تھے۔

"ضروری نہیں کہ مہنگی چیز بہتر بھی ہو۔ چیزوں کو ان کی قیمت کے حساب سے نہیں اپنے بیٹے کی پسند کے حساب سے تولیے۔" مگر ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی اور جب آئی تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اسمارہ کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ حذیفہ کی طرف دیکھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ آنکھیں کھولنے پر اگر اپنے بیٹے کے چہرے پر اپنے لیے نفرت یا ملامت نظر آئی تو وہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔

حذیفہ کا دوسرا ہاتھ جو کافی دیر سے ان کے ماتھے کو ہولے ہولے سہلا رہا تھا ایکدم سے ہٹ گیا۔

اسمارہ کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔

اور پھر۔۔۔

اس ہاتھ کی جگہ حذیفہ نے اپنے لب رکھ دیے۔ اسمارہ کی بند آنکھوں سے آنسو اب روانی کے ساتھ بہنے لگے۔

"میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کر ڈالی نا؟"

"آپ نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ پھر بھی اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو سمجھ لیجیے گا کہ حساب برابر ہو گیا۔ اس احسان کا بدلہ اتر گیا جو آپ نے پال پوس کر مجھے بڑا کرنے میں میری ذات پر کیا تھا۔"

"پاگل نہیں کے۔" اسمارہ تکلیف کے باوجود مسکرا دیں۔ "ماں اولاد کو پال کر احسان نہیں کرتی۔"

"تو پھر ماں اولاد کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کر سکتی۔" حذیفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر۔۔۔"

"بس۔۔۔" حذیفہ نے اسمارہ کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اگر میری قسمت میں جویریہ سے ملنا لکھا ہے تو وہ ایک دن مجھے ضرور ملے گی۔" حذیفہ نے کہا۔

اسمارہ نے کچھ دیر حذیفہ کے چہرے پر پھیلے یقین کو دیکھا پھر اپنے لبوں پر رکھی اس کی انگلی کو چوم لیا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ پالک کے پتوں کو تسلے میں ڈال کر صحن میں لگے نل کے نیچے دھونے کے لیے لے آئی۔

پالک ندیم صاحب کی پسندیدہ سبزی ہوا کرتی تھی۔ پالک گوشت وہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ اب پالک گوشت پسند کرنے والے ندیم صاحب رہے نہ ہی وہ گھر جہاں یہ پکتا تھا۔

جویریہ اب خالہ بتول کے ساتھ منیر بھائی کے گھر میں رہائش پذیر تھی۔

"دیکھ بیٹا! اب تیرا اس گھر میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔" خالہ بتول نے جویریہ سے کہا تھا۔ "جس گھر میں مرد کا سایہ نہ ہو وہاں ایک چھوڑ کئی مکار نظریں لگی رہتی ہیں۔ میں ٹھہری بڈھی بیمار عورت

میرے ساتھ رہ بھی جاؤں تو کہاں تک تیری حفاظت کر سکوں گی۔" وہ اسے اپنے بیٹے کے پاس لے آئی تھیں۔

نکاح والے واقعے کے بعد جویریہ اس قدر ڈر گئی تھی کہ چاہ کر بھی خالہ سے اختلاف نہ کر سکی۔ لاہور سے واپسی پر وہ اس قدر پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی کہ خود سے کوئی بھی فیصلہ لینے کے قابل نہ رہی تھی۔ ایسے میں خالہ کا احسان کم نہ تھا کہ انہوں نے جویریہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کی ہامی بھری تھی۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو؟" کسی نے جویریہ کے ہاتھ سے جھپٹ کر تسلہ چھینا جس کے کناروں سے پانی کے ساتھ پالک کے پتے بھی بہہ کر نالی میں تیرتے جا رہے تھے۔

"ستیاناس مار دیا ساری سبزی کا۔ اب بچا ہی کیا ہے پکانے کو۔"

یہ خالہ کی بہو نسرین تھی جو پانی سے بھرے تسلے میں ہاتھ مار کر بچی کھچی پالک کا اندازہ لگاتے ہوئے غصے سے بول رہی تھی۔

جویریہ شرمندہ ہو گئی۔ اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوب کر اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کتنی پالک پانی کے ساتھ بہہ کر ضائع ہو چکی تھی۔

نسرین کو تو خالہ کا وجود ہی گوارا نہ تھا۔ اس کا گھر کون سا محل تھا۔ دو افراد کی گنجائش نکالنے میں اسے کافی تنگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اوپر سے بیٹھے بٹھائے جویریہ مفت میں نسرین کے سر پر آ پڑی تھی۔ وہ جویریہ کو کبھی کبھی عجیب نظروں سے دیکھتی کہ جویریہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتی۔

گرمیوں میں چھٹیوں کے لیے راولپنڈی جانے سے قبل جویریہ (Lums) کے سمر کوارٹر ______ کے لیے رجسٹریشن کروا کر گئی تھی مگر جویریہ کے راولپنڈی پہنچتے ہی حالات نے جس طرح کروٹ بدلی اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جویریہ کا فوری طور پر پڑھائی کے لیے واپس آنا ممکن نہیں رہا۔ جویریہ کے اس آپشنل کوارٹر کو چھوڑ دینے کی اس وقت حذیفہ نے بھی پذیرائی کی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ندیم صاحب کی موت کے فوراً بعد جویریہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں کہ یونیورسٹی کی ٹف روٹین اور مشکل پڑھائی کو برداشت کر سکے۔

منیر بھائی کے گھر میں لینڈ لائن نہیں تھی مگر جویریہ نے منیر کے موبائل سے حذیفہ کو متعدد بار فون کرنے کی کوشش کی مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ کامیاب نہ ہو سکی۔

"منیر بھائی! ایک بار پھر میں لاہور جا کر کوشش کرنا چاہتی ہوں۔" حذیفہ سے رابطے میں ناکامیوں سے تنگ آ کر جویریہ نے آخر منیر سے کہا۔

"وہاں جانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ جس سے ملنا ہے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔ اپنی ماں کو علاج کے لیے ملک سے باہر لے کر گیا ہوا ہے۔"

منیر نے یہ بتا کر جویریہ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

وہ اس بار لاہور سے واپسی پر پوری خبر لے کر آیا تھا۔

حذیفہ کے چلے جانے کا سن کر جویریہ کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دینے لگا۔

آخر وہ اسے اس طرح بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔

"صبر کر بیٹا! جہاں اتنا انتظار کیا تھوڑا سا اور کر لے۔ اپنی ماں کو علاج کے لیے لے کر گیا ہے' جلد یا بدیر لوٹ کر آ ہی جائے گا۔ فکر نہ کر۔" خالہ بتول بھی جویریہ کو تسلی دیتیں۔

پر فکر نہ کرنا جویریہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ صبر وہ تب سے اب تک کیے ہی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حذیفہ کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل نہیں ہو سکی۔ وہ لوگوں کے سامنے مطمئن ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ خالہ کی یہ سب کہنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ میرے ساتھ اس کی زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔ جس کا وہ سوگ منائے گا؟"

عرشی کو اسمارہ پر سخت غصہ تھا جنہوں نے کمرے میں اس کی موجودگی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے حذیفہ سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس وقت عرشی نے نجانے کیسے اپنی طبیعت کے خلاف خود کو کچھ بھی کہنے سے روکے رکھا پر اب وہ شدید طیش کے عالم میں سارے کمرے میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے خالہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" عرشی نے دانت پیستے ہوئے شدید تیزی سے کہا۔

"چھوڑو بھی اب۔ وہ بیمار ہے۔ بیماری میں انسان الٹی سیدھی باتیں کر جاتا ہے۔ غصہ تھوکو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اتنی ٹینشن تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔"

رعنا نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ عرشی امید سے تھی اور ہر ماں کی طرح اس حالت میں رعنا کو بھی اس کی بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔

حذیفہ جب اسمارہ کو علاج کے لیے باہر لے جانے لگا تھا تو عرشی بھی ساتھ ہولی۔ ویسے بھی وہ اور حذیفہ شادی کے بعد کہیں گھومنے کے لیے نہیں گئے تھے۔ ان کی شادی ہی اتنی ایمرجنسی میں ہوئی تھی پھر اسمارہ کی طبیعت بھی اس عرصے کے دوران کچھ ایسی بگڑتی سنورتی رہی کہ اگر کہیں جانے کا کوئی موقع میسر آتا بھی تو حذیفہ اسمارہ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کبھی نہیں جاتا۔

پر اب یہ سب خود سے ہی بن گیا تھا۔

عرشی کا خیال تھا کہ اسمارہ کے علاج کے بہانے ان کی تفریح بھی ہو جائے گی پر وہاں جا کر وہ الٹا بور ہو گئی۔ حذیفہ تو اسمارہ کو لے کر ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے بیچ گھن چکر بنا رہتا اور عرشی پہلے کی دیکھی بھالی ساری جگہوں پر بار بار اکیلے جا کر اکتا گئی۔

اس نے ایک بار حذیفہ سے ساتھ چلنے کو بھی کہا مگر حذیفہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے پاس بالکل بھی وقت نہیں۔ عرشی کو جہاں جانا ہے وہ شوق سے جا سکتی ہے۔

"پر تم بھی تو ساتھ چلو نا۔ سیر کا مزا تب ہی آتا ہے جب کوئی ساتھ دینے والا ہو۔" عرشی نے حذیفہ کے پاس بیٹھتے ہوئے شکوے سے کہا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں یہاں سیر سپاٹے کے لیے آیا ہوں؟" جواب میں حذیفہ نے برف سے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ عرشی مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

لندن قیام کے دوران حذیفہ کی پوری توجہ اسمارہ کی طرف ہی رہی۔ رفتہ رفتہ یہ چیز بھی عرشی کو کھٹکنے لگی۔

اس میں خود غرضی کا عنصر ضرورت سے زیادہ تھا۔ تمام عمر ہر ایک کی توجہ کا بلا شرکت غیرے مرکز رہنے کے بعد اس کی خود کو اولین اہمیت ملتا دیکھنے کی عادت بھی پختہ ہو چکی تھی۔ ایسے میں وہ ایک شخص جس کی سوچوں پر بھی عرشی حاوی ہو جانے کی خواہش رکھتی تھی اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف متوجہ رہے چاہے وہ دوسرا اس کی بیمار ماں ہی کیوں نہ ہو، عرشی کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگا۔

اسی بات کو لے کر عرشی اور حذیفہ کے درمیان شادی کے بعد پہلا جھگڑا ہوا اور عرشی شدید غصے کے عالم میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر پہلی فلائٹ سے پاکستان واپس آ گئی۔

اس کی اس جلد بازی پر رعنا نے اسے خوب کھری کھری سنائیں۔

"میں نے تمہیں یہاں سے جاتے وقت سمجھایا تھا کہ حذیفہ کو راضی کرو کہ وہ لندن والا اپنا آفس سنبھال لے۔ وہاں مستقل رہائش اختیار کرنا تمہارے لیے کتنا ضروری ہے۔ مجھے تمہیں سمجھانے کی ضرورت ہے کیا؟ اس کے باوجود تم نے کیا کیا؟ لو جھگڑ کر یہاں آ گئیں۔"

"آپ نے بھی تو کتنی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں رہائش اختیار کر لے۔ اس نے آپ کی مان لی جو میری مانے گا؟ ایک نمبر کا ضدی ہے وہ۔ ویسے بیمار ماں کے سرہانے ساری عمر بیٹھا رہے گا مگر سیٹل ہونے کی بات کرو تو صاف انکار۔ اب جب واپس آئے گا تو آپ ہی کوشش کر کے دیکھ لیجئے گا۔" عرشی نے بے زار

سے کہا۔

عرشی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دنیا کے بہترین ڈاکٹروں اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبی سہولیات کی موجودگی میں حذیفہ کو اسمارہ کی دیکھ بھال خود کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

☆ ☆ ☆

اپنی زندگی کی لڑائی تو اسمارہ بہت پہلے ہی ہار چکی تھیں۔ یہ حذیفہ ہی تھا جو ہتھیار پھینکنے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ اس دن جب لندن میں خلاف توقع بہت خوب صورت دھوپ نکلی تھی اسمارہ ساتھ چھوڑ گئیں۔ حذیفہ کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے ایک چہرہ بار بار آئے جا رہا تھا۔ اور وہ تھا اسمارہ کا چہرہ۔

کبھی کھانے میں نخرے کرتے دس سالہ حذیفہ کے منہ میں نوالے بنا کر ڈالتیں اسمارہ تو کبھی سائیکل پر سے گر کر چوٹ لگوا آنے پر حذیفہ کے زخموں کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی لاپروائیوں پر اسے ڈانٹتی ہوئیں اسمارہ۔ حذیفہ کی کبھی کوئی آیا نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کے بہت قریب رہا تھا اور بہت تھوڑے وقفے سے دونوں ہی اس سے جدا ہو کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ دکھ کی انتہائی کیفیت میں تنہا بیٹھا حذیفہ انہیں یاد کر کے بے تحاشا رویا۔

☆ ☆ ☆

عرشی نے لاؤنج سے گزرتے رعنا کو سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ فون پر بات کرتے سنا۔ وہ حذیفہ سے اسمارہ کی میت کو پاکستان واپس لانے کے انتظامات کے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔

حذیفہ کے بعد جس دوسری شخصیت پر اسمارہ کی موت کا سب سے زیادہ اثر ہوا وہ رعنا تھیں۔

انہیں حذیفہ کے درد کا بھی احساس تھا۔

اتنے قلیل عرصے کے دوران یہ دوسری ڈیڈ باڈی تھی جسے حذیفہ پاکستان لے کر آ رہا تھا۔

پہلے باپ پھر ماں۔ حذیفہ کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی یہ رعنا سمجھ سکتی تھیں۔

عرشی رعنا کو وہاں سے آنکھیں پونچھتا چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اسمارہ کی موت کا افسوس اسے بھی تھا لیکن اس کے غم میں وہ شدت نہیں تھی جو حذیفہ اور رعنا محسوس کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب جویریہ کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔

کچھ عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی پر خواب سے منسلک کوئی منظر، کوئی بات ذہن کے پردے پر اب منعکس نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے بمشکل دو ڈھائی فٹ کے فاصلے پر بچھی چارپائی کے اوپر منیر بھائی کے ساتھ سات سالہ گڈو اور نو سالہ پپو بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔

جویریہ پانی پینے کے لیے اٹھی۔

کچن کا دروازہ بند تھا۔ ساتو بلی کی ستائی نسرین سونے سے پہلے اسے مقفل کرنا کبھی نہیں بھولتی تھی۔ ساتو کے لیے تو خیر دروازہ بند کر دینا بھی کافی تھا۔ قفل لگانے کی اضافی ضرورت صرف ساتو کے لیے تھی یا پھر...؟

خالہ کے دروازے کے باہر برآمدے میں پانی کی بھری گھڑونچی رکھی رہتی تھی۔ خالہ کو گھڑے کا پانی پسند تھا۔ وہ بہت اہتمام کے ساتھ روانہ گھڑونچی میں پانی بھر کر اس کی گردن پر کیاری سے توڑے موتیے کے پھولوں کا ہار سجاتی تھیں۔

خالہ کے کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند نہ تھا۔ روشنی کی باریک لکیر کے ساتھ اندر سے باتوں کی دھیمی دھیمی آواز بھی آ رہی تھی۔

خالہ کو اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اس لیے ان کا دیر تک جاگتے رہنا جویریہ کے لیے حیرانی کی بات نہ تھی۔ حیرت اسے اندر سے آتی باتوں کی آواز پر ہوئی۔

کون تھا جو اتنی رات گئے خالہ کی شب بیداری میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

نسرین بھابھی سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی

تھی۔ شاید منیر بھائی ہے۔؟

اس نے گھڑے کے اوپر اوندھے دھرے اسٹیل کے گلاس کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے آتی آوازوں میں اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔

"جویریہ لاہور جانے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہے۔ کسی دن یہاں سے نکل کر خود ہی پہنچ گئی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" یہ خالہ بتول کی آواز تھی۔

"کیے کرائے کو چھوڑ اماں! یہ بات کھل گئی تو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔" یہ منیر تھا جو بولا تھا۔

"تجھے یاد نہیں اماں! لاہور سے واپسی پر جویریہ کو یہاں چھوڑ کر جب تجھے لینے گیا تھا تو اس کا شوہر اسے وہاں پہنچ کر ڈھونڈ رہا تھا۔ کم بخت محلے والوں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں ہی جویریہ کو لاہور لے کر گیا ہوں پر میں بھی اڑ ہی گیا کہ میں تو جویریہ کو اڈے پر چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ آگے مجھے کچھ نہیں پتا تو بڑی مشکل سے اس سے جان چھڑائی تھی میں نے۔" اندر منیر نے شاید کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"یہ سب تو گزری ہوئی باتیں ہیں۔ اب آگے کی سوچ! آخر اسے کب تک یہاں بہانے بنا کر روکے رکھیں گے؟ ابھی تک تو تیرے میرے بھروسے پر بیٹھی ہوئی ہے پر کبھی نہ کبھی تو اسے شک پڑ ہی جائے گا۔" خالہ نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں اماں کہ ذرا دھیان رکھا کر۔ بس تھوڑے عرصے کی بات ہے۔ بیگم صاحب کہہ رہی تھیں کہ وہ سب جلد ہی باہر رہائش اختیار کرنے والے ہیں۔ ایک بار وہ لوگ یہاں سے نکل گئے تو پھر جاتی رہے جہاں اس کا دل کرتا ہے۔"

"آئے ہائے منیر! یہاں سے چلے جانے کے بعد بیگم صاحب ہمیں پیسے بھجوانے بند تو نہیں کر دیں گی نا؟" خالہ کو نئی فکر نے آ گھیرا۔

"تو فکر نہ کر اماں! ان کے جانے سے پہلے ہی میں اتنی رقم بٹور لوں گا کہ سالوں عیش کریں گے۔" منیر نے تسلی دی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" خالہ کو اطمینان ہوا۔

"ویسے منیر! ہے تو عقل کا پورا۔ تبھی ہوشیاری سے کام لیا۔ جو واپس جا کر اس بیگم سے سارا معاملہ طے کر لیا۔"

"ہاں اماں! میں نے سوچا کہ بیگم صاحب اس بات کی منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں کہ جویریہ ان کے لڑکے سے نہ ملے تو کیوں نہ اس بات کا فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے جا کر بیگم صاحب کو سمجھایا کہ ڈرانے دھمکانے یا زور زبردستی کرنے سے یہ لڑکی پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ اس کو دور رکھنے کے لیے پیار بھرے بہلاووں سے کام لینا ہو گا اور یہ کام ہم لوگ کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہمیں اس کام کے دام دیے جائیں۔ شکر ہے کہ بیگم صاحب کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔" منیر نے کہا۔

"اللہ بھلا کرے بیگم صاحب کا۔ اس بار جو پیسے دیں گی ان سے میں پورے پانچ تولے کے کڑے بنواؤں گی۔" خالہ نے پرشوق لہجے میں کہا۔

"اماں! تیری عمر ہے کڑے پہن کر پھرنے کی؟" منیر نے بے زاری سے کہا۔

"کیوں میری عمر کو کیا ہوا؟ ابھی بھی بننے اوٹنے میں تیرے سے اچھی ہوں۔ اپنی شکل دیکھی ہے کبھی۔ ایسا لگتا ہے باندر (بندر) کے منہ پر مونچھیں اگ آئی ہیں۔" خالہ بدک کر بولیں۔ عمر کا طعنہ دل کو لگا تھا۔

"تو ناراض کیوں ہو رہی ہے اماں! میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔" منیر ماں کو جلال میں آتا دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ کمرے کے اندر ناراضی بھری خاموشی طاری ہو گئی۔

کمرے کے باہر کھڑی ہوئی جویریہ کا پورا وجود پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

کچھ دیر پہلے اس نے ایک خواب دیکھا تھا جو اسے بالکل بھی یاد نہیں تھا مگر اس خواب کی وحشت نے اسے نیند سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور اب اس نے سنا وہ خواب سے کہیں زیادہ بھیانک تھا کہ نہ تو وہ بیدار ہو کر اس حقیقت سے فرار حاصل کر

سکتی اور نہ ہی اسے کبھی بھلا سکتی تھی۔

جویریہ لرزتے قدموں کے ساتھ دروازے سے ہٹ کر مڑی اور دھک سے رہ گئی۔

اس کے پیچھے خالہ کی بہو نسرین کھڑی تھی۔

"تو آخر تم نے سب کچھ خود ہی سن لیا۔ اچھا ہوا کم از کم تمہاری آنکھوں پر سے پٹی تو اتر گئی۔" نسرین نے مدھم آواز میں کہا تو جویریہ حیرت سے گنگ اسے دیکھے گئی۔

"تم کس قدر بے وقوف لڑکی ہو۔" نسرین تاسف سے سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"تمہیں تب بھی کچھ سمجھ نہیں آیا جب منیر تمہیں لاہور سے واپسی پر تمہارے گھر لے جانے کے بجائے یہاں لے کر آیا اور اماں جو میرے دروازے پر کھڑا ہونا بھی پسند نہیں کرتی تھیں، وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اماں نے تمہیں یہاں لے کر آنے کی کیا وجہ بیان کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اماں تمہیں وہاں اپنا تمہارے گھر میں رہنے دینے کا حوصلہ نہیں لے سکتی تھیں۔ وہاں پڑوسیوں اور محلے داروں سمیت بے شمار لوگ تمہارے جاننے والے تھے جبکہ یہاں پر کوئی بھی تم سے واقف نہیں اور تمہارے ان بے شمار جاننے والوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ تم اس وقت کہاں ہو۔ کوئی تمہیں ڈھونڈنا بھی چاہے تو نہیں کھوج سکتا۔ اماں اور منیر نے بہت ہوشیاری کے ساتھ سارا کام نمٹایا ہے۔ یہ دونوں جنہیں تم آج تک اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتی رہی ہو، تمہارے ہمدرد یا خیر خواہ نہیں ہیں بلکہ تمہاری نگرانی پر مامور ہیں اور تم ان ہی پر بھروسا کر کے بیٹھی ہو۔" نسرین دبی آواز میں جویریہ کو سرزنش کر رہی تھی اور جویریہ فق چہرہ لیے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟" جویریہ بمشکل یہ کہنے میں کامیاب ہوئی۔ گلے میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا تھا۔

"بات بگاڑنے یا سنوارنے کی نہیں ہے۔ بات پیسے کی ہے۔ پیسہ اچھے اچھوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب اماں نے تمہیں پناہ دی ہو تب ان کے ذہن میں نفع نقصان کا کوئی خیال نہ آیا ہو پر اب ایسا نہیں ہے۔ اب منیر ہر مہینے جا کر اس بیگم سے اچھی رقم لے آتا ہے جو ان دونوں ماں بیٹے کے ضمیر کی عدالت پر تالا ڈال دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنے بچوں کی پرورش حرام مال پر نہیں کرنا چاہتی۔" نسرین آہستہ آواز میں انکشافات کر رہی تھی۔

"میں اسی لیے تمہیں یہاں رکھنے کے بالکل بھی حق میں نہیں تھی۔ اماں اور منیر پر تمہارے اندھے اعتماد کو دیکھ کر مجھے چڑ ہوتی تھی لیکن میں چاہ کر بھی تمہیں کچھ نہیں بتا پائی۔ اس وقت منیر اور اماں کے سروں پر دولت کا بھوت سوار ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف ذرا سا بھی کچھ کروں گی تو یہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ پر اب تو تمہیں سب کچھ خود ہی پتا لگ گیا ہے اب اگر اپنے شوہر سے ملنا چاہتی ہو تو کسی بھی طرح ان دونوں کے چنگل سے نکل جاؤ۔" نسرین نے اسے مشورہ دیا۔

"مگر کیسے؟ یہ لوگ مجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔" جویریہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ بتول خالہ اور منیر کی اصلیت جان لینے کے بعد وہ ان سے کسی بھی انتہائی قدم کی توقع کر سکتی تھی۔

جویریہ کی بات سن کر نسرین سوچ میں پڑ گئی پھر کہنے لگی۔

"کل منیر نے میرے ساتھ کاکے کو حفاظتی ٹیکہ لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ گھر پر صرف اماں ہی ہوں گی۔ ان کا دھیان بٹتے ہی ادھر ادھر ہو تم موقع پا کر نکل جانا۔"

نسرین کے کمرے کی طرف سے کسی بچے کے کسمسا کر رونے کی آواز سنائی دی۔ شاید کاکا جاگ گیا تھا۔ نسرین نے بتول خالہ کے کمرے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا پر دروازے کے پیچھے سے کسی قسم کی حرکت کی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

نسرین جویریہ کے قریب ہوتی ہوئی جلدی سے بولی۔

"تم اس وقت اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ اور دیکھو کسی کو پتا نہ لگے کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔"

نسرین کے منت بھرے انداز پر جویریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے واقعی لوگوں کی پہچان نہیں تھی، جسے وہ اکثر سمجھتی رہی، وہ اپنی گرہستی کو خطرے میں ڈال کر اسے خبردار کر گئی تھی۔

اور بتول خالہ... جنہیں جویریہ نے فرشتہ سمجھا، وہ کیا نکلیں؟

بتول خالہ اور منیر نے کس کس طریقے سے جویریہ کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھایا، یہ سوچ کر بھی اب جویریہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ اسے اب سمجھ میں آرہا تھا کہ اس کے کسی کو بھی لکھے خطوط کے جوابات آج تک کیوں موصول نہیں ہوئے کیونکہ منیر بھی وہ خط پوسٹ ہی نہیں کرتا ہوگا۔

اس کی فون نمبروں والی ڈائری کئی بار یاد دلانے کے باوجود منیر پرانے گھر سے لا کر دینا ہر بار کیوں بھول جاتا تھا۔

بتول خالہ اور منیر نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ نہ صرف اس کی کسی سے بھی رابطہ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنایا تھا بلکہ اسے اپنے جھوٹے خلوص اور اپنائیت کے جال میں کچھ اس طرح پھنسایا کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔

بتول خالہ اور منیر کے پیار و الفت کے پیچھے چھپی اصلی کہانی جان کر جویریہ کو ان سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ مکروہ چہرے پر خوب صورت چہرہ سجائے رکھنے والے دوغلے لوگ۔

نسرین کاکے کو سلانے جا چکی تھی۔ جویریہ نے بھی اپنے تلاطم بھرے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

اماوس کی رات تھی۔ صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت فضا میں گونجنے والی واحد آواز اس جھینگر کی تھی جو کسی کونے میں چھپا نہایت مستقل مزاجی سے بول بول کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔

پھر نجانے کیسے احتیاط کے ساتھ اندھیرے میں قدم رکھتی ہوئی جویریہ کا پاؤں اچانک سخت اور ٹھنڈی زمین کے بجائے کسی نرم اور جان دار چیز پر جا پڑا۔ فضا میں جھینگر کی یکسانیت بھری آواز کو دباتی ہوئی ایک ہولناک قسم کی چیخ کے ساتھ وہ چیز جویریہ کے پیر کے نیچے سے اتنی تیزی کے ساتھ نکلی کہ خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کے باوجود جویریہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور دھپ سے زمین پر جا گری۔

"ارے یہ مانو کیوں چلائی؟ جا کر دیکھ کہیں منڈیر سے گر تو نہیں گئی... اب اٹھ بھی جا بدذات حرام..." تیز آواز پر کمرے کے اندر سے بتول خالہ نے منیر کو جگایا جو ان کے پیر دابتے دابتے وہیں لڑھک گیا تھا۔

"کیا ہے اماں... بلی ہی تو ہے۔ گر بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ کیا بگڑ جائے گا اس کا؟" منیر کچی نیند ٹوٹنے پر جھلا گیا۔

"جاتا ہے یا نہیں۔" خالہ نے تپ کر پیٹھ پر دھموکا جڑا۔

"جاتا ہوں اماں! کم بخت سوتی بھی تو دیوار پر ہے۔ گرے گی نہیں تو اور کیا ہوگا۔" منیر بلی کو کوستا کمرے سے باہر نکلا۔

جویریہ کا کمرا بتول خالہ کے کمرے کے پار تھا۔ خالہ کے دروازے پر آجانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس نہیں جا سکتی تھی اور صحن میں سوائے اندھیرے کے اسے چھپانے والی اور کوئی چیز بھی نہ تھی۔

"اے مانو تو ٹھیک ہے نا؟" اندر سے خالہ کی آواز آئی۔

"مانو یہاں نہیں ہے۔" منیر نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

پھر اس کی نظر اندھیرے میں دم سادھے زمین پر گری ہوئی جویریہ پر پڑی۔

"یہاں پر تو جویریہ ہے اماں!" وہ بولا۔

"ہیں؟... جویریہ... ارے کہیں اس

نے سن تو نہیں لیا؟"

بتول خالہ کو اپنے اور منیر کے بیچ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو یاد آگئی تو وہ گھبرا کر ننگے پیر ہی پلنگ سے اتر کر باہر آگئیں۔

باہر آکر انہوں نے کھٹ سے برآمدے کا بلب جلا کر اندھیرے کو روشنی میں بدلا۔

جویریہ کی بہت ساری خامیوں میں ایک خامی یہ بھی تھی کہ اسے خود پر جھوٹ کا خول چڑھانا نہیں آتا تھا۔ طرف ایک نظر اس کی اڑی ہوئی رنگت پر ڈالتے ہی بتول خالہ کو اپنے سوال کا جواب خود بخود مل گیا۔

اس کے بعد صرف ایک لمحہ ایسا آیا جس میں صحن میں موجود تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ پر بت بنے خوف زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے، پھر رات کے سناٹے کو بتول خالہ کی چنگھاڑتی آواز نے توڑا۔

"منیر! پکڑ اسے... جلدی۔" خالہ کا یہ حکم سن کر جویریہ کی جان نکل گئی۔ وہ تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر دروازے کی طرف دوڑی۔ منیر بھی فوراً خالہ کے حکم کی تعمیل میں اس کے پیچھے لپکا۔

اندھیرے میں کچھ دیر پہلے سنائی دینے والی دلدوز چیخ ایک بار پھر گونجی۔ اس بار منیر تھا جس کا پاؤں مانو کے اوپر آیا تھا جو اپنی مخصوص منڈیر کو چھوڑ کر آج زمین پر سونے کا تجربہ کر رہی تھی۔

منیر نے لڑکھڑاتے ہوئے ایک موٹی سی گالی مانو کی شان میں بیان کی اور اسے لات مار کر اپنے راستے سے ہٹایا۔ زندگی میں پہلی بار بتول خالہ نے اپنی چہیتی بلی کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ سلوک پر نہ تو احتجاج کیا نہ ہی اس کی پروا کی۔ ان کا دھیان مکمل طور پر دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکلتی جویریہ کی طرف تھا۔

"منیر... پکڑ اسے... یہ نکل گئی تو ہم برباد ہو جائیں گے... جلدی۔"

خالہ صحن میں کھڑی چیخ رہی تھیں۔

جویریہ کو یہاں کے راستوں کا صحیح علم نہیں تھا پھر بھی وہ رکی نہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تنگ گلیوں سے نکل کر کھلی جگہ پر پہنچ گئی۔ گھر چوبارے، تھڑے پیچھے رہ گئے۔ قدموں کے نیچے پتھروں اور اونچی نیچی ڈھیریوں والی زمین آگئی اور اس کے بعد تارکول کی بنی سیدھی سڑک۔ مگر جویریہ کو گھبراہٹ میں شاید ہی دونوں کا فرق محسوس ہوا ہو۔

جویریہ کو معلوم تھا کہ منیر اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے ایک دوبار اسے مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ اسی پیچھے مڑ کر دیکھنے کے چکر میں اسے سامنے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی نہیں نظر آئیں، جو اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

گاڑی کے بریک جویریہ سے دو فٹ کے فاصلے پر چرچرائے۔ جویریہ کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ وہیں سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

"او مائی گاڈ... رشید! یہ تم نے کیا کر دیا؟" گاڑی کے اندر بیٹھے پروفیسر اختر محمود نے حواس باختہ ہو کر اپنے ڈرائیور سے کہا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے سر! یہ خود ہی بھاگتی ہوئی ایک دم سے گاڑی کے سامنے آگئی تھی۔" رشید نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

"اچھا! جلدی سے اتر کر دیکھو۔ کہیں گاڑی سے ٹکرا کر زخمی تو نہیں ہو گئی؟"

"گاڑی تو اسے لگی ہی نہیں۔ وہ تو پہلے ہی سڑک پر گر گئی تھی۔" رشید نے کہا۔

"اچھا اب اتر کر دیکھو تو سہی اسے ہوا کیا ہے؟" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"سر جی! میرا خیال ہے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" رشید ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس کو ادھر ہی پڑا چھوڑ جائیں؟" پروفیسر صاحب بگڑ کر بولے۔ "حد ہوتی ہے بے حسی کی۔"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں جی۔ آپ باہر سے آئے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا، یہاں اسی طرح بہلانے سے گاڑیاں رکوا کر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔"

رشید گاڑی کو گیئر میں ڈال کر وہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

جب پروفیسر صاحب گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر خود باہر نکل آئے تو بادل نخواستہ رشید بھی اترا۔

سڑک کے بیچ میں بے سدھ پڑی لڑکی کم از کم بے ہوش ہونے کا ڈراما نہیں کر رہی تھی' اس کا اندازہ پروفیسر صاحب کو اسے دیکھتے ہی ہو گیا۔ رشید کی مدد سے لڑکی کو اٹھا کر انہوں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔

"گاڑی واپس موڑو رشید! اسے فی الحال سینٹر لے جاتے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے پیچھے بے ہوش پڑی جویریہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جویریہ کا پیچھا کرتے منیر نے بڑی بے بسی سے دیکھا تھا۔ اس کے پہنچنے تک وہ دونوں آدمی جویریہ کو گاڑی میں ڈال کر لے جا چکے تھے۔

واپس پلٹتے ہوئے اس نے تشویش کے ساتھ سوچا کہ وہ رعنا بیگم کو یہ بات کس طرح بتائے گا کہ جویریہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔

پروفیسر اختر محمود نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو بند کر کے دیکھا اور میز سے دوسری فائل اٹھائی جو پہلے سے بھی زیادہ ضخیم تھی۔

اس وقت جس کمرے میں پروفیسر صاحب بیٹھے تھے اس میں ان کی بڑی میز کرسی اور اس کے پیچھے کھڑی فائلیں رکھنے والے جہازی سائز کیبنٹ کے بعد بہت کم جگہ بچتی تھی۔ اپنی آدھی سے زیادہ عمر انہوں نے پڑھنے لکھنے کی نذر کر ڈالی تھی۔

وہ طویل عرصے تک مقامی کالج میں سوشل سائنسز کے مضامین پڑھاتے رہے تھے۔ بیوی عرصہ پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اولاد خدا نے دی نہیں تھی۔ اسی لیے جب انہیں بیرون ملک کی ایک یونیورسٹی سے پڑھانے کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے بلا جھجک قبول کر لی۔ باہر کی زندگی پروفیسر صاحب کو راس آئی۔

نہ کوئی گرہ نہ کوئی افراتفری۔

کئی سال تک پروفیسر صاحب گوروں کو سوشل سائنسز کی تھیوریاں پڑھاتے رہے اور سماجی الجھنوں کو سنوارنے کے گر سکھاتے رہے۔ شاید ان کی باقی زندگی بھی ایسے ہی گزر جاتی اگر ان کی ملاقات باز سے نہ ہوتی۔

باز کا تعلق ڈنمارک سے تھا اور وہ ایک سوشل ورکر تھا۔ جب پروفیسر صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی' اس وقت وہ یورپ میں کام کر رہا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد ایسی تنظیموں کو بے نقاب کرنا تھا جو یورپ کے کم ترقی یافتہ ممالک سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کو جھانسا دے کر دوسرے ممالک میں اسمگل کرتے اور قبیح دھندوں کی زینت بنا دیتے۔ اس کی ریسرچ اور محنت کی وجہ سے کئی ایسے گروہوں کی نشاندہی ممکن ہو سکی تھی جو ان قبیح کاموں میں ملوث تھے۔

باز سے مل کر پروفیسر کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ سماج کو بدلنے کے لیے بڑی بڑی کانفرنسوں میں پیپر پڑھ دینا' معتبرین کی تھیوریز رٹ لینا اور چند ایک پراجیکٹس کی سپر فیشل سرپرستی کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ پاتال ہے جس کے اندر اتر کر اپنے ہاتھوں سے گندگی کو صاف کرنا پڑتا ہے۔

باز کی سنگت میں پروفیسر صاحب نے بہت کچھ دیکھا' وہ کچھ سیکھا جو دنیا کی تمام کتابیں مل کر بھی نہیں سکھا سکتی تھیں۔ وہ جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اس عمر میں آ کر وہ فقط اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہی آنے والی نسل میں منتقل کرنے کے قابل رہ گئے ہیں' خود نئے تجربوں سے روشناس ہونے لگے۔ انہیں اس بات سے بھی اتفاق ہو گیا کہ انسان کی عمر وہیں ٹھہرتی ہے جہاں وہ ٹھہر جائے۔ اسی لیے کچھ لوگوں کی زندگی تیس پینتیس برس کی عمر میں ہی رک جاتی ہے۔ صرف عمر آگے بڑھتی ہے' زندگی نہیں اور کچھ لوگ سو سال کے ہو کر بھی بہتے پانی کی طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

"کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس کام کو ختم کرنے کی مہلت ملے گی

یا نہیں۔ کام کو نیک نیتی سے شروع کرنا انسان کا فرض ہے اور اسے مکمل کرنے کا وقت دینا خدا پر منحصر ہے۔" یہ باز کا فلسفہ تھا۔

پروفیسر صاحب کو اپنے سے کہیں کم عمر اس نوجوان کا اللہ کی رحمت پر بھروسا شرمندہ کر گیا اور وہ اپنی عمر رفتہ کے بیتے سالوں کی تعداد بھلا کر تن دہی کے ساتھ کام میں جت گئے۔

پروفیسر صاحب کو وطن واپس بھجوانے کا سہرا بھی ایک طرح سے باز کے ہی سر جاتا تھا۔

کچھ عرصے سے باز نے اپنے کار خیر کا دائرہ وسیع کرنا شروع کیا تھا۔ اب اس کی توجہ صرف یورپ اور یہاں ہونے والی زیادتیوں پر نہیں رہی تھی بلکہ اس کی سرپرستی میں چلنے والی تنظیم کا جال تیسری دنیا کے ان ترقی پذیر ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا تھا جو ان گھناؤنے جرائم میں ملوث تھے۔

"پروفیسر! میں کمبوڈیا جا رہا ہوں۔" باز نے ایک دن پروفیسر صاحب سے کہا۔

"مگر کیوں؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

"کیونکہ وہاں میری ضرورت ہے۔ وہاں قدم قدم پر افلاس و غربت ہے۔ وہاں جسم فروشی کے اڈے صرف اغوا کر کے یا جھانسا دے کر نہیں چلائے جاتے بلکہ اکثر اوقات ماں باپ خود پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے تو اپنی اولادوں کو اس پیشے میں دھکیل دیتے ہیں۔"

"لیکن تم اکیلے کیا کرو گے؟" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"اکائی کی طاقت کو کبھی کم مت سمجھنا پروفیسر! اگر میرے جانے سے کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی بدلاؤ آ جاتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔" باز متانت سے بولا۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے پروفیسر؟" باز نے اچانک کہا تو پروفیسر صاحب نے اسے چونک کر دیکھا۔

"میں؟"

"ہاں یہاں کا کام تو کوئی بھی دیکھ لے گا۔ ہمیں ان لوگوں کی مدد کا بیڑا اٹھانا چاہیے جو حالات کی چکی میں پس کر خود اپنی مدد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ جرم مٹانے کے لیے اس بھوک کو ختم کرنا ہو گا جو جرم کرنے پر اکساتی ہے۔ ہمیں اس ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا ہو گی جو ناانصافیوں کو پنپنے کی اجازت دیتا ہے۔" باز نے جذب کے عالم میں کہا تو پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر چل رہے ہو میرے ساتھ؟" باز نے پوچھا۔

"ضرور چلوں گا۔" پروفیسر صاحب مسکرائے۔

"مگر تمہارے ساتھ نہیں۔ کہتے ہیں کہ نیک کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ اگر بات ناانصافی کو ختم کرنے کی اور ماحول میں تبدیلی لانے کی ہے تو اس کی ضرورت میرے ملک میں بھی کم نہیں۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

یوں باز کمبوڈیا کے لیے روانہ ہوا اور پروفیسر صاحب ایک بار پھر اسی سرزمین پر لوٹ آئے جسے وہ برسوں پہلے الوداع کہہ گئے تھے۔ یہ باز کی سنگت کا اثر تھا کہ محض لمبی میزوں پر بیٹھ کر بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے وہ عملی طور پر فلاحی کاموں میں خود کو مصروف رکھے تھے۔

کام کی لگن میں نہ انہیں گرمی کا پتا چلتا نہ سردی کا اور نہ ہی دوسری کسی قسم کی دقتیں ان کو پریشان کرتیں جو ان سے کہیں کم عمر سوشل ورکرز تک کی راہ میں اکثر رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

ڈنمارک جیسے صاف ستھرے اور سرد ملک میں پل کر جوان ہونے والا باز اگر کمبوڈیا کو برداشت کر سکتا ہے تو پھر یہ تو ان کی اپنی دھرتی تھی جس پر انہوں نے زندگی کے کئی سال بتائے تھے۔

پروفیسر صاحب نے آخری فائل بند کر کے میز پر رکھی اور سگریٹ سلگا کر لبوں سے لگاتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

سینٹر کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھی۔ پانچ کمروں اور چھوٹے سے احاطے پر مشتمل یہ وومن سینٹر ایک مقامی این جی او کے تحت عورتوں کی فلاح و

بھو کے لیے چلائے جانے والے ادارے کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی۔

چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں کے قریب ایسی کئی آؤٹ پوسٹ بنائی گئی تھیں تاکہ اندرون اور پسماندہ حصوں میں رہنے والی خواتین کو اپنے مسائل لے کر یہاں پہنچنے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

وہ عورت جس کو مارا پیٹا جاتا تھا' وہ جسے جلایا گیا ہوتا تھا' وہ جس کے بچے چھین کر اسے گھر سے باہر نکال دیا جاتا تھا اور وہ بھی جس کی مرضی کے خلاف اس کے اپنے ہی گھر والے اسے کسی کے ہاتھ شادی کے نام پر بیچ رہے تھے۔

کسی نہ کسی طرح لمبی مسافتیں طے کرتی ہوئی وہ اس جگہ پر انصاف کی امید لے کر پہنچتی تھیں۔ ان میں سے اکثر خواتین کے گھر والے ان کے پیچھے آکر ان سے صلح صفائی کر کے انہیں واپس لے جاتے تھے۔ اگر وہ خواتین بھی واپس لوٹ کر جانا چاہتیں تو انہیں روکا نہیں جاتا تھا۔ بعض معاملات کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ انہیں طول دیے بنا ہی نپٹا دینا ان عورتوں کے حق میں بہتر ہوتا۔ البتہ اگر ان پر ڈھائے گئے مظالم انتہائی سفاکانہ اور سنگدلانہ نوعیت کے ہوتے تو پھر ان عورتوں کا اندراج کر کے انہیں لاہور سینٹر بھجوا دیا جاتا جہاں ان کے نسبتاً طویل عرصے تک قیام و طعام کا بہتر انتظام تھا۔

پروفیسر صاحب جب سے یہاں آئے تھے' سب جگہوں کا باقاعدگی سے دورہ کیا کرتے تھے۔ کئی ایسی باتیں' ایسے مسئلے جو دور بیٹھے پتا نہیں چلتے تھے' یہاں آ کر آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ اس وقت بھی پروفیسر صاحب اس چھوٹے سے کمرے میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے سینٹر کی حالت میں بہتری لانے کے لیے فنڈز جمع کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کر رہے تھے۔

دستک کی آواز پر پروفیسر صاحب نے اپنے خیالات کی دنیا سے نکلتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" جالی کے دوسری طرف کھڑی لڑکی جھجکتے ہوئے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

"ہاں' شیور! آجاؤ۔"

پروفیسر صاحب سیدھے ہوتے ہوئے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے تو وہ جالی کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

یہ وہی لڑکی تھی جسے رات پروفیسر صاحب بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر سے اٹھا کر یہاں سینٹر لے کر آئے تھے۔

اس چھوٹی سی آؤٹ پوسٹ کا بجٹ کسی مستند ڈاکٹر کو رکھنے کا متحمل تو نہیں ہو سکتا تھا البتہ ایک لیڈی ہیلتھ ورکر اور گورنمنٹ اسپتال کی ایک ریٹائرڈ نرس کسی بھی قسم کی ایمرجنسی سے نپٹنے کے لیے چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتی تھیں۔

نرس کی ماہرانہ رائے کے مطابق اسے کوئی سنگین مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ وہ فقط بے ہوش تھی اور تھوڑی دیر میں اسے بنا کسی تردد کے خود ہی ہوش میں آجانا چاہیے تھا۔

نرس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ صبح تک لڑکی کو ہوش آگیا اتنا اندازہ تو پروفیسر صاحب کو اس کے بنا پوچھے ہی ہو چکا تھا کہ وہ کسی اچھے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔

"سر! آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنا تھی۔ آپ لاہور جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں؟"

جویریہ کو اپنے ایک دن کے قیام کے دوران یہ بات پتا چل چکی تھی کہ سینٹر میں موجود دوسرے لوگوں کی طرح پروفیسر صاحب یہاں کے مستقل رہائشی نہیں ہیں۔

"بالکل لے جاسکتا ہوں۔" پروفیسر صاحب جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' جس کے چہرے پر سرخی تھی اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر انگلیوں کو مسلتے ہوئے وہ کافی نروس بھی لگ رہی تھی۔

"لیکن میرے ایک سوال کا جواب تمہیں بھی دینا ہوگا۔" وہ کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

"رات گئے سڑک پر اکیلی کیا کر رہی تھیں؟"

"کسی سے بچ کر بھاگ رہی تھی۔" جویریہ نے آہستہ سے کہا۔

"کس سے؟" پروفیسر صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تھے کچھ بے ضمیر لوگ جن کے لیے دولت انسانیت سے زیادہ اہم ہو چکی تھی۔"

"ہوں۔" پروفیسر صاحب سمجھ گئے تھے کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ سو خاموش ہو گئے۔

"ہم کل صبح ہوتے ہی لاہور کے لیے نکل پڑیں گے۔ تم تیار رہنا۔" قدرے توقف کے بعد یہ کہتے ہوئے انہوں نے سامنے رکھی فائل پھر سے کھول لی۔ جویریہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا بہت پر آسائش تو نہیں' البتہ آرام دہ ضرور تھا۔

کمرے کے باہر وقفے وقفے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو گھر میں کام کرنے والے نوکروں کی تھیں۔

جویریہ اور پروفیسر صاحب صبح پانچ بجے سینٹر سے نکلے تھے اور اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ راہوالی والے مین سینٹر سے لاہور تک کا راستہ پانچ گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا مگر پروفیسر صاحب راستے میں چند کام نپٹانے کے لیے کئی جگہوں پر رکتے آئے جس کی وجہ سے اتنی دیر لگ گئی۔

ایک تو لمبا سفر' دوسرا راستے میں کئی جگہوں پر حد سے زیادہ خراب اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں' دونوں چیزوں نے مل کر جویریہ کو لاہور پہنچنے تک نڈھال کر دیا۔

جویریہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ اچھے خاصے عمر رسیدہ ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب لاہور پہنچنے کے بعد گھر میں چاق و چوبند پھر رہے تھے۔ یہ پروفیسر صاحب کا آبائی گھر تھا۔ باہر سے لوٹ کر آنے کے بعد وہ یہیں رہتے تھے۔

"جویریہ!" پروفیسر صاحب نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے پکارا پھر کوئی جواب نہ پا کر نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔

اندر بیڈ پر جویریہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ غالباً سستانے کے لیے بستر پر لیٹی تھی کہ نیند آگئی۔

پروفیسر صاحب کو اس کا سویا ہوا تھکا ماندہ چہرہ دیکھ کر بے اختیار ترس آیا۔ وہ تو اس ساری بھاگ دوڑ کے عادی تھے مگر اس بے چاری لڑکی کو اپنے ساتھ اونچے نیچے راستوں اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر گھنٹوں گھماتے رہنا اس کے ساتھ زیادتی تھی۔ انہیں چاہیے تھا کہ اسے راہوالی سے سیدھا لاہور لے آتے۔ کام کسی اور دن پر ٹالے جاسکتے تھے۔

باہر ملازمہ نے میز پر ناشتے کے لوازمات لگا دیے تھے مگر انہوں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے دروازہ بند کر کے واپس چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

گھر کا بڑا سا آہنی گیٹ کھلا ہوا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بلا روک ٹوک جاری تھی۔ صرف جویریہ تھی جو گھر کے سامنے خاموش کھڑی تھی۔ خوف اور بے اعتمادی اس کی فطرت کا حصہ تھی جس میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اتنی دور سے یہاں تک پہنچ گئی پر اب اندر جانے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حوصلہ کرتے ہوئے اس نے گھر کے اندر قدم رکھا اور اس دہلیز کو پار کر لیا جس کے دوسری طرف جانے کی اجازت اسے پچھلی بار نہیں دی گئی تھی۔

گیٹ سے داخل ہوتے ہی سامنے کچھ فاصلے پر گھر کا داخلی دروازہ تھا اور اس دروازے کے عین درمیان میں اس وقت رعنا کھڑی تھیں۔ بے اختیار اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ رعنا وہ ہستی تھیں جن سے سامنا نہ ہونے کی دعائیں جویریہ سارا راستہ مانگتی آئی تھی۔ اس نے

سر پر اوڑھی چادر کو انگلیوں کی مدد سے چہرے کے سامنے لا کر اپنے آپ کو چھپانے کی بے حد فضول سی کوشش کی۔

رعنا چونکی تھیں۔ جویریہ کی اضطراری حرکت نے انہیں اس کے بارے میں اور بھی متجسس کر دیا۔ ایسا کون تھا ان کے حلقہ احباب میں اتنا باحیا اور پابند حجاب! رعنا آگے بڑھیں۔

"تم؟" وہ اسے دیکھ کر شاک کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئیں۔ منیر نے یقیناً "جویریہ" کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع دے کر ان کے ہاتھوں بے عزت ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

جویریہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر رعنا اتنی ہی خوفزدہ ہو گئی تھیں جتنی شاید جویریہ انہیں دیکھ کر تھی۔

وہ ایک جست میں جویریہ تک پہنچیں اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف کو لے گئیں جہاں وہ گیٹ سے وقتاً "فوقتاً" اندر آنے والوں کی نظروں سے قدرے اوجھل ہو گئے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی دوبارہ یہاں آنے کی؟ اتنی بڑی بڑی رقمیں ہضم کر لینے کے بعد بھی تم لوگوں کا پیٹ نہیں بھرا جو پھر سے یہاں پہنچ گئی ہو؟ بے شرم، بے غیرت کہیں کی۔" رعنا غصے سے تلملا رہی تھیں۔

ان کی بات پر جویریہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ رعنا شاید اسے بھی لالچ کے اس گھناؤنے کھیل میں حصہ دار سمجھ رہی تھیں۔

"میرا یقین کیجیے مجھے ان پیسوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ آپ سے جو کچھ لیا منیر اور خالہ نے لیا۔ میں اس سارے معاملے سے قطعی لاعلم تھی۔" جویریہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بکواس بند کرو۔" رعنا بگڑ کر بولیں۔

جویریہ کو دور رکھنے کا معاہدہ کس کے ساتھ طے ہوا تھا اور اس معاہدے کی شرائط کیا تھیں۔ یہ رعنا جویریہ سے زیادہ بہتر جانتی تھیں۔ انہیں رقم جانے کا افسوس نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ جس مقصد کے لیے رقم صرف کی گئی تھی وہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر اس وقت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ رعنا ایسے موقع پر کوئی شور شرابہ یا کسی قسم کا کوئی تماشا کھڑا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر میں حذیفہ بھی آ جانے والا تھا اور اس کے بعد سب کھیل ختم۔ وہ جویریہ کو حذیفہ سے ملنے سے اب نہیں روک سکتی تھیں۔ انہیں اپنے تن بدن میں شدید تھکاوٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔ ایک ایسی تھکاوٹ جو انسان پر اپنی یقینی شکست کو سامنے دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔

"آخر تم کیوں ہماری زندگیاں برباد کرنے پر تلی ہو لڑکی؟" انہوں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کسی کی بربادی نہیں چاہتی۔" جویریہ نے کہا۔

"میں تو خود بربادی کے دہانے پر کھڑی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میرے بارے میں اچھا نہیں سوچتیں لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے حذیفہ کی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میری دنیا میں حذیفہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ خدارا میری حالت پر رحم کیجیے۔ مجھے ایک بار حذیفہ سے مل لینے دیجیے۔" جویریہ نے رعنا کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ وہ خاموش رہیں۔ جویریہ نے جو کہا انہوں نے نجانے سنا بھی تھا یا نہیں ان کی سوچ کا رخ عرشی کی طرف مڑ چکا تھا۔

اب جب کہ تھوڑی دیر میں سارا کھیل ہی ختم ہو جانے والا تھا تو وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ کیا عرشی اپنی زندگی میں جویریہ کی وجہ سے آنے والی تبدیلی کو قبول کر پائے گی؟ شاید نہیں! عرشی مرضی کے خلاف کچھ بھی تو قبول نہیں کرتی تھی اور پھر یہ تبدیلی آئے گی کس حد تک؟ رعنا کو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ جویریہ کے حذیفہ کی زندگی میں پھر سے شامل ہو جانے کے بعد عرشی کا کیا مقام ہو گا؟ رعنا یہ بھی نہیں جانتی تھیں۔ اتنی محنت اتنی پلاننگ کا فائدہ؟

رعنا تھک کر پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گئیں جو عام ڈرائیوروں یا نوکروں کے ستانے کے لیے وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

انہیں بے اختیار اسمارہ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ ہوتیں تو شاید کوئی راستہ نکل سکتا تھا۔ وہ حذیفہ کو قابو کر سکتی تھیں۔

پر اب اسمارہ کہاں؟ آج سب انہیں بھی دغا دے گئے۔ پہلے دانش پھر اسمارہ اتنے کم عرصے میں دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلے گئے۔ اس گھر کے در و دیوار پر رعنا کو اب تک ان دونوں کا عکس جھلملاتا محسوس ہوتا تھا۔

"بہت شوق تھا تمہیں اس گھر پر راج کرنے کا تو جاؤ! اب اس خالی گھر پر راج کرو اور یہ جان کر خوش ہو جاؤ کہ تمہاری نحوست نے ایک بستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔" رعنا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" جویریہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کبھی اس گھر میں اس کے مکینوں کے دم سے خوشیاں بھری رہتی تھیں۔ اب نہ وہ مکین رہے نہ ہی خوشیاں۔ دونوں کو تمہاری نحوست کھا گئی۔" رعنا نے بھرائی آواز میں کہا۔

جویریہ کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی نے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

ایک دم بہت سی ایسی باتیں اور منظر واضح ہونے لگے جو اس نے گیٹ سے داخل ہوتے وقت دیکھے یا سوچے تھے مگر پھر رعنا کا اچانک سامنا ہونے کی گھبراہٹ میں انہیں بھلا دیا تھا۔ گھر میں لوگوں کی آمد و رفت گھر کے اندرونی حصے کے علاوہ لان میں لگائی گئی کرسیوں پر تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کے بیٹھنے کا انتظام۔

ایک شدید کپکپی جویریہ کے جسم پر طاری ہو گئی۔ یہ کپکپی خوف کی لہر تھی جو اس کے وجود میں سے ہو کر گزری تھی۔

"گھر خالی ہو گیا۔ مکین ہی نہ رہے۔" جویریہ کے ذہن میں رعنا کے کہے الفاظ گونجنے لگے۔

"تو کیا حذیفہ بھی؟" جویریہ نے رکتی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوچا۔

لیکن نہیں! یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کا تو دل اب حذیفہ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حذیفہ کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور جویریہ کو پتا بھی نہ چلے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" جویریہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ جو سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ "حذیفہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے لینے آئے گا۔ وہ اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔ وہ مجھے اس طرح اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"ایسا ہی ہوا ہے۔ تمہارے نہ ماننے سے حقیقت بدل۔۔۔" رعنا کو بیچ فقرے میں اندازہ ہوا کہ جویریہ ان کی بات کا کیا مطلب سمجھ رہی ہے تو وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔

ان کا سب سے پہلا اور فطری رد عمل یہ تھا کہ وہ ایسی نامعقول بات سوچنے پر جویریہ کے منہ پر کس کر تھپڑ لگا دیں۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک دوسری سوچ نے ان کے اندر اٹھنے والے اشتعال کو دبا لیا۔ شاید یہی طریقہ ہو اس لڑکی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا۔۔۔

اگر اسے یہ یقین دلا دیا جائے کہ حذیفہ ہی نہیں رہا تو۔۔۔

"یہ کب۔۔۔ کیسے ہوا؟" جویریہ نے بے تحاشا کپکپاتے لبوں کے ساتھ رعنا سے پوچھا۔

"اسمارہ کو علاج کے لیے باہر لے کر گیا تھا۔ وہیں پر ایکسیڈنٹ ہو گیا۔"

رعنا نے چہرے کو سپاٹ رکھتے ہوئے کہا تو جویریہ سن رہ گئی۔

کبھی اسے لگا کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں حذیفہ کا انتظار، اس سے ملنے کی آس باقی نہ رہی تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گی۔ وصل کی امید ہی اس کے جینے کا بہانہ تھی مگر آج یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔

پھر بھی وہ ابھی تک زندہ تھی۔ کس قدر سخت جان اور ڈھیٹ تھی وہ۔ جویریہ نے پتھرائی آنکھوں کے ساتھ سامنے منڈیر پر دھوپ میں کھیلتی ننھی چڑیا کو دیکھا۔

سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے کچھ لمحے پہلے تک تھا۔

پرندے اسی طرح چہچہا رہے تھے۔ دھوپ اتنی ہی چمکیلی تھی۔ زمین اب بھی اپنے مدار پر پہلے کی طرح گھوم رہی تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی دنیا تہ و بالا ہو گئی اور کسی چیز پر ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔

"باجی 'باجی جی!" گھر کی ایک نوکرانی رعنا کو آوازیں دیتی پھر رہی تھی۔ بیسیوں کام تھے جو رعنا کو نپٹانے تھے۔ سینکڑوں مہمان تھے جو رعنا کے منتظر تھے 'پر اس وقت رعنا کا دھیان ان میں سے کسی کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس وقت جویریہ کی آنکھوں سے لحظہ بہ لحظہ خارج ہوتی ہوئی زندگی کی رمق کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

رعنا کو حیرت ہو رہی تھی کہ جویریہ نے ان کی بات کو اتنی آسانی سے کیسے قبول کر لیا۔ رعنا نہیں جانتی تھیں کہ جویریہ اپنی زندگی میں آنے والی مایوسیوں اور ناکامیوں کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اسے خود بھی اپنی بدبختی کا یقین ہو چکا ہے۔

جویریہ کے لیے ان حالات میں کسی خوش خبری پر یقین کرنا' کسی بری خبر کو مان لینے سے زیادہ دشوار کام تھا۔

رعنا نے ایک بار پھر بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ حذیفہ سمیت تمام مرد کسی بھی وقت اسامہ کو دفنا کر واپس آ سکتے تھے مگر اس کے باوجود رعنا نے عرشی کی خاطر یہ خطرہ مول لیا۔ اولاد کی محبت ماں باپ سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔

"دیکھو لڑکی! ہم پر ابھی بہت مشکل وقت آیا ہوا ہے۔" رعنا نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "اس لیے بار بار یہاں آ کر ہماری مشکلات میں اور اضافہ مت کرو۔ اگر تمہارے دل میں حذیفہ کے لیے واقعی اچھے جذبات تھے تو پھر اس قصے کو یہیں ختم کر دو۔ جانے والے اس دنیا سے جا چکے۔ اب اپنا نام ان کے ساتھ جوڑ کر ان کی بنی بنائی عزت کو خراب مت کرو۔" رعنا دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

جویریہ نے رعنا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"امینہ۔۔۔ بی بی کو باہر تک چھوڑ آؤ۔" رعنا نے نوکرانی سے کہا جو انہیں ڈھونڈتی ہوئی بالآخر ان تک پہنچ ہی گئی تھی۔

رعنا نے امینہ کے ساتھ بنا کسی مزاحمت کے جاتی جویریہ کی پشت کو دیکھ کر بے اختیار جھرجھری لی۔ انہیں اچانک ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو لڑکی ابھی ابھی ان کے سامنے دروازے سے باہر نکل کر گئی ہے اس کا شمار زندہ لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا۔

☼ ☼ ☼

دن ڈھلنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا جب پروفیسر صاحب نے اسے دیکھا۔ وہ گھٹنوں سے اوپر جاتی گھاس اور جھاڑیوں کے بیچ کھڑی سیمنٹ کی ٹوٹی سلیب پر بیٹھی ہوئی تھی۔

صبح پروفیسر صاحب اس لڑکی کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں سوتا چھوڑ کر باہر گئے تھے۔ واپس لوٹے تو وہ جا چکی تھی۔

"جی! انہوں نے جاتے وقت کچھ نہیں بتایا۔" گھر کی ملازمہ سے استفسار کرنے پر انہیں جواب ملا تھا۔ انہیں لڑکی کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر کوفت ہوئی تھی اور اب محض چند گھنٹوں کے قلیل وقفے کے بعد وہی لڑکی انہیں سڑک کے کنارے ماحول و گرد و نواح سے قطعی بے نیاز یوں بیٹھی ہوئی ملی کہ پروفیسر صاحب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

"سر! گاڑی چلاؤں؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے رشید نے پوچھا جسے ابھی تک گاڑی سڑک کے کنارے اچانک رکوانے کی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

پروفیسر صاحب تذبذب کا شکار ہو گئے۔ یہ لڑکی ان کی ذمہ داری نہیں۔ سوائے اس کے نام کے وہ اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے لیکن ان کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو اس

طرح سڑک پر بے اماں چھوڑ کر چلے جائیں۔

"سر! چلیں؟" رشید نے ایک بار پھر اکتا کر پوچھا۔

"نہیں! ایک منٹ رکو۔" پروفیسر صاحب نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟" مسز ملک کمرے کی کھڑکی کے باہر برگد کے پیڑ تلے بیٹھی جویریہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

جواب میں پروفیسر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بھی مسز ملک کے برابر کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگے جہاں جویریہ ایک بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے گرد لپٹی گرم شال کھل کر فقط اس کے کندھوں پر ٹکی رہ گئی تھی اور شال کے دونوں کونے زمین تک لٹک رہے تھے۔

"اس کی یہ حالت کب سے ہے؟" مسز ملک نے اس کی گم صم کیفیت کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"جب سے اسے یہاں لے کر آیا ہوں۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ "اگر میں اس سے پہلے مل نہ چکا ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا کہ یہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے۔ جس نے اس کے ہونٹوں پر قفل لگا دیے ہیں۔ جب سے آئی ہے' ایک بار بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔"

پروفیسر صاحب جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہے تھے جو کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں گاڑے بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ وہ اکثر اسی طرح موسم کی شدت سے بے نیاز ایک ہی جگہ پر بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزار دیا کرتی تھی۔

"اگر یہ خود سے کچھ بتانے کے قابل نہیں تو آپ کسی اور ذریعے سے اس کے بارے میں پتا لگانے کی کوشش کرتے۔ کسی تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ' جہاں سے یہ ملی ہے اس کے گرد و نواح میں پوچھ گچھ وغیرہ۔" مسز ملک نے کہا۔

پروفیسر صاحب مسز ملک کو جویریہ کے راہوالی کے قریب سڑک پر بے ہوش ملنے کا قصہ بھی سنا چکے تھے۔

"اپنے طور پر پتا لگانے کی کوشش کی تھی میں نے۔"

"پھر؟" مسز ملک نے سوالیہ نظریں پروفیسر صاحب پر گاڑیں۔ جواب میں پروفیسر صاحب نے کندھے اچکا کر اس کشمکش میں اپنی شکست کا اعتراف کیا۔

"تو پھر آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ ہماری این جی او ان مظلوم اور لاچار عورتوں کی مدد کرتی ہے جو حالات کا شکار ہو کر ہم سے مدد مانگنے آتی ہیں۔ ہم خود کسی کے پاس نہیں جاتے نہ ہی کسی کو زبردستی آنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ ہماری این جی او کا اصول ہے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم اپنی تنظیم کے بنائے اصولوں سے انحراف نہ کریں۔" مسز ملک کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا۔

مسز ملک اس این جی او کی سرپرست اعلیٰ تھیں۔ راہوالی والی آؤٹ پوسٹ' لاہور کا یہ وومن سینٹر اور اس جیسے کئی ادارے ان کی سرپرستی میں چلتے تھے۔

قصور مسز ملک کا نہیں تھا' ماضی میں نا تجربہ کاری کے ہاتھوں کھائی ایک چوٹ کا تھا جس کی تکلیف مسز ملک کو آج بھی محسوس ہوتی تھی۔

اپنے کام کے ابتدائی دنوں میں مسز ملک نے ایک ایسی لڑکی کو پناہ دی تھی جس کا ہاتھ ایک خطیر رقم کے عوض اس کی مرضی کے خلاف ایک بڑی عمر کے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا اور جس کو اس فیصلے کے خلاف سر اٹھانے کی جرات کرنے کے جرم میں جرگے نے موت کی سزا سنائی تھی۔

اس سنگ دلانہ فیصلے پر مسز ملک کے اندر کی عورت جوش میں آ گئی۔ پسماندہ علاقوں کی معصوم اور کم عمر لڑکیوں کو پیسوں کے لالچ میں عمر رسیدہ آدمیوں سے بیاہ دینے کی رسم کے خلاف انہوں نے زوردار آواز اٹھائی۔ جب خوب ہاہا کار مچ گئی تو انکشاف ہوا کہ وہ بھولی اور معصوم نظر آنے والی لڑکی گھر سے فرار ہونے سے قبل اپنے بوڑھے شوہر کو کھانے میں زہر دے کر

اگلے جہان پہنچانے کا بندوبست کر کے آئی تھی۔

مسز ملک کے ہوش اڑ گئے۔ جرم کی نوعیت ایسی تھی کہ آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی گئیں۔ اخباروں میں اس قصے کو جس طرح اچھالا گیا اس سے مسز ملک کی تنظیم کی نیک نامی خطرے میں پڑ گئی۔

"میں آپ کے قائم کردہ اصول و ضوابط سے واقف ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں مگر اصولوں کی پاس داری میں اصل مقصد کو نظر انداز مت کیجئے۔ اور وہ ہے ضرورت مند کی مدد کرنا۔ مشکل وقت اور مشکل حالات میں سہارا فراہم کرنا۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ضرورت مند کی مدد سے مجھے انکار نہیں مگر ہم وسائل کی کمی کی بدولت ایک حد سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ جانتے ہیں کہ سینٹر میں موجود خواتین کی تعداد گنجائش سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔ ایسے میں ایک اور فرد کا اضافہ؟" مسز ملک نے پریشانی سے کہا۔

یہ بات پروفیسر صاحب بھی جانتے تھے کہ ان کے پاس فنڈز کی بھی کمی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس لڑکی کو مسز خان کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ان کی تنظیم لاوارث اور لاپتا افراد کے کیس ہینڈل کرنے کا زیادہ تجربہ رکھتی ہے۔" مسز ملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مسز خان کی تو آپ بات ہی مت کیجئے۔ وہ عورت این جی او کے نام پر کیا کچھ کر رہی ہے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" پروفیسر صاحب ایک دم ہی بھڑک گئے۔

"جن فنڈز کو جمع کرنے کے لیے ہم دن رات خوار ہوتے پھرتے ہیں' ان کا مسز خان فقط دو دن میں انتظام کر لیتی ہیں۔" مسز ملک نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ مسز خان کو باہر سے بڑی بڑی رقومات ملتی تھیں اور وہ این جی او کی آڑ میں ملک دشمن سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"مسز خان کے اس ٹیلنٹ سے تو میں بھی بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" پروفیسر صاحب نے دبے غصے کے ساتھ کہا۔ "اگر آپ اس لڑکی کو یہاں نہیں رکھ سکتیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر مسز خان جیسی دوغلی عورت کے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔"

"پروفیسر صاحب! اس ملک میں ہزاروں لاکھوں لڑکیاں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مسئلے کا شکار ہیں۔ آپ کس کس کو سپورٹ کریں گے؟" مسز ملک نے ان سے پوچھا۔

"میں ساری دنیا کو نہیں بدل سکتا لیکن اگر میری کوشش سے کسی ایک شخص کی زندگی میں بہتری آ سکتی ہے تو میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا۔" پروفیسر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

یہ بھی ان بڑے فلسفیوں میں سے ایک تھا جو اس نے کمبوڈیا روانگی سے قبل پروفیسر صاحب کے گوش گزار کیا تھا اور جسے انہوں نے اپنی زندگی کے سنہری اصولوں میں شامل کر لیا تھا۔

"مسز ملک کم از کم اس ضمن میں آپ کو میرا ہم خیال ہونا چاہیے تھا۔ آپ جیسی مخلص سماجی کارکن کے منہ سے ایسی ناامیدی کی بات سن کر مجھے حقیقتاً مایوسی ہوئی ہے۔" پروفیسر صاحب نے مسز ملک کو ان کی منفی سوچ پر شرمندہ کیا تو وہ واقعی شرمندہ ہو گئیں۔

"اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ یہ لڑکی یہاں رہے تو ٹھیک ہے۔ میں اس کی اجازت دے دیتی ہوں مگر یہ اکیلی نہیں رہے گی میری ایک ملازمہ اس کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ رہے گی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہمیں اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں۔"

مسز ملک نے کہا تو پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے اس انتظام پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی' آپ کی بڑی مہربانی بہت ہے۔ آیئے! میں آپ سے اس کی ملاقات کرواتا ہوں۔"

"پھر بھی سہی اس وقت مجھے وزیر صاحب کے ساتھ میٹنگ کے لیے جانا ہے۔" مسز ملک نے اپنا موبائل اور ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"میں جاتے ہی اپنی ملازمہ کو بھجوا دوں گی۔ میرے بہت اعتبار کی عورت ہے۔"
مسز ملک یہ کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ دیکھو یہ بڑے والے اس طرف۔ چھوٹے دوسری طرف اور جو پھٹے ہوئے نکلیں گے "انہیں اس ٹوکری میں ڈال دینا۔ آئی سمجھ؟" بے تحاشا گھنگھریالے بالوں والی صفیہ نے جویریہ کو سمجھایا۔
موسم سرما کے بہت سارے کہر میں لپٹے دھندلے دنوں کے بعد آج صاف اور اجلا دن نکلا تھا۔ سینٹر کی بہت ساری عورتیں ایک بڑے سے روشن کھڑکیوں والے کمرے میں موجود تھیں جہاں جگہ جگہ پرانے اخبارات اور رسالوں کے ڈھیر لگے تھے۔ زمین پر پرانی دریاں بچھی تھیں جو کہیں کہیں سے ادھڑی ہونے کے باوجود فرش کی ٹھنڈک سے بچانے میں کافی مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ دریوں کے اوپر کاغذ کے ڈھیروں کے نزدیک چند عورتیں لفافے بنانے میں مصروف تھیں۔
یہ زنانہ لفافہ فیکٹری کا آئیڈیا پروفیسر صاحب کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کے فارغ بیٹھنے سے بہتر تھا کہ انہیں کام میں لگا کر دھیان بٹایا جائے۔
جویریہ کو یہاں ویمن سینٹر میں پناہ لینے والی عورتوں کی کیٹگری میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ نہ تو وہ ان عورتوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی نہ ہی اس کے جسم پر صبح شام کھائی جانے والی مار کے نشان تھے۔ پھر بھی پروفیسر صاحب کو لگتا تھا جیسے اس کی روح گھائل ہو چکی ہے۔ وہ کسی ایسے لمحے میں مقید ہو گئی ہے جس نے حقیقت کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا ہے۔ اسے اس لمحے کی قید سے کیسے آزاد کرایا جائے، یہ پروفیسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
فی الحال جویریہ کی حالت کے پیش نظر اسے چھانٹی کا آسان ترین کام سونپا گیا تھا۔ جویریہ کے پاس ہاتھ میں قینچی لیے بیٹھی بسنت بی بی چھانٹی کیے گئے کاغذات میں سے غیر مناسب سائز اور کترے کناروں والے کاغذات کو کاٹ کر انہیں مناسب حالت میں لے کر آ رہی تھی۔
"چھیتی کر کڑیے! (جلدی کرو لڑکی)" بسنت بی بی نے جویریہ سے کہا۔
جویریہ نے کاغذوں کا اگلا بنڈل اٹھایا۔ یہ کسی اخبار کے ساتھ چھٹی والے دن نکلنے والا چند صفحوں پر مشتمل میگزین تھا جس کے صفحات پر شہر کے امراء کی سوشل سرگرمیوں کی تصاویر تھیں۔ میگزین سال سے زیادہ پرانا تھا۔
جویریہ نے میگزین درمیان سے کھول کر پہلا صفحہ پنوں کی گرفت سے آزاد کرایا جس پر کسی مشہور بوتیک کے افتتاح پر آنے والی میک اپ سے لپی عورتوں کی تصویریں تھیں۔
دوسرا صفحہ بھی پن سے جدا ہوا جس پر کسی کے گھر منعقد کی گئی غزل نائٹ پر آنے والی مشہور ماڈل جگمگا رہی تھی۔
تیسرا صفحہ اسی دعوت کے مزید مہمان گروپ کی شکل میں کھڑی ہو کر فوٹو کھنچوانے والی چند عمر رسیدہ عورتیں تھیں اور ان سے اگلی تصویر میں ایک مانوس چہرے والا نوجوان جو ہاتھ میں کولڈ ڈرنک تھامے کیمرے کی آنکھ میں مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔
جویریہ کے عرصے سے ماؤف ذہن میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ ایک روشنی پھیلی جس نے اندھیروں میں ڈوبی ہر بات، ہر چہرہ، ہر یاد کو پھر سے روشن کر دیا۔ لیکن یہ عجیب روشنی تھی جو سکون و عافیت کی جگہ درد کا شدید احساس اپنے ساتھ لے کر آئی کہ جویریہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دماغ کی رگیں جکڑی گئیں۔ جسم چیخ کر ٹوٹنے لگا۔ درد ناقابل برداشت ہو گیا۔
جویریہ کی کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر آتی فلک

شگاف چیخوں کو سن کر لفافے بناتی عورتوں کے ہاتھوں سے کاغذ چھوٹ کر زمین پر بکھر گئے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر اس طرف دیکھا جہاں جویریہ حذیفہ کی تصویر والے میگزین کے بچے کھچے کاغذوں کو ہاتھ میں جکڑے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات جویریہ کے لیے قیامت کی رات تھی۔ ساری رات وہ ہوش اور بے ہوشی کی ملی جلی کیفیات کے درمیان جھولتی رہی۔
اپنے ہوش کے مختصر وقفوں کے دوران وہ اپنا سر تکیے پر پٹخ پٹخ کر ساتھ بیٹھی عورتوں کی پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیتی۔ اس کے جلتے جسم کی حدت کو کم کرنے کے لیے ماتھے پر رکھی گیلی پٹیاں پھسل پھسل جاتیں۔
جانے کیسی تڑپ بیدار ہو گئی تھی اس میں جو اسے کسی طور چین نہ لینے دے رہی تھی۔
"آپ لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اس کی حالت اتنی خراب تھی اور آپ لوگ اسے بجائے ہسپتال لے جانے کے اپنے ٹوٹکے آزماتے رہے۔" پروفیسر صاحب نے گرج کر کہا۔
"باقی سب تو ان پڑھ اور گنوار عورتیں ہیں۔ کم از کم آپ ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا بندوبست کر لیتیں یا پھر مجھے فون کر کے مطلع کر دیتیں۔" پروفیسر صاحب نے سینٹر کی مستقل رہائش پذیر نرس سے طنزیہ کہا جو سر جھکائے شرمندہ کھڑی تھی۔
"اب یہاں کھڑی مت رہیے۔ جا کر فوراً گاڑی نکلوائیے۔ اسے ابھی اسی وقت ہسپتال لے کر جانا ہے۔" پروفیسر صاحب نے حکم دیا۔
"وہ جی! ہسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ملکانی جی کو فون کر دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو لے کر آ رہی ہیں۔" یہ نرس کے برابر میں کھڑی ہوئی مسز ملک کی ملازمہ تھی جس نے اپنی زبان کھولی تھی۔
پروفیسر صاحب نے اس مداخلت پر اس عورت کو پرجلال انداز میں گھور کر دیکھا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"مسز ملک خدا جانے کب یہاں پہنچیں گی۔ اب اور وقت ضائع مت کیجیے۔ جا کر گاڑی نکلوائیے میں خود ساتھ جاؤں گا۔"
"بی بی آ گئیں۔" مسز ملک کی خادمہ نے پروفیسر صاحب کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے جوش کے عالم میں گیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں سے سلیٹی رنگ کی ایک گاڑی اندر آ رہی تھی۔
پروفیسر صاحب نے مڑ کر دیکھا تو گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر مسز ملک واقعی ایک سفید اوور آل والی ڈاکٹر کو لیے اتر رہی تھیں۔
اندر کمرے میں جویریہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ غنودگی میں بھی کئی پریشان آوازیں اسے اپنے ارد گرد سنائی دے رہی تھیں۔
کمرے میں اور بھی لوگ موجود تھے جو اس کی بگڑتی حالت سے خوف زدہ ہو چکے تھے اور اسے بچانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔
تب ہی ایک آواز اس کے نیم خوابیدہ ذہن کے پردے کو چیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی۔
ایک ایسی جادوئی آواز جس نے جویریہ کے موت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے قدموں کو ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا۔
جویریہ نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اعصاب شکن رات نے جسم و جاں میں اتنی طاقت نہیں چھوڑی تھی جو اسے اس کوشش میں کامیاب ہونے دیتی۔ آس پاس بے شمار ابھرتی آوازوں کے شور میں جویریہ نے ایک بار پھر اس طلسماتی آواز کو تلاشنا چاہا جو حیات بن کر اس کی روح میں اتری تھی مگر بہت ساری دوسری آوازوں کے شور میں وہ کہیں گم سی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اپنے ہی غموں سے نڈھال جویریہ ایک بار پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔
(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لندن میں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن میں وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے' حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا تو وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جویریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی' جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر جاتا ہے تو راستے میں جویریہ سے ملنے کے لیے راولپنڈی اتر جاتا ہے۔ وہاں ندیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ حذیفہ انہیں اسپتال لے کر جاتا ہے۔ وہ جویریہ کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں' کیونکہ ادھیڑ عمر اور عیاش مختار وڑائچ' جویریہ کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ ندیم صاحب حذیفہ کی رضامندی سے ایمرجنسی میں حذیفہ اور جویریہ کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ حذیفہ اپنے باپ دانش کو آگاہ کرتا ہے۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں' مگر اچانک انتقال کر جاتے ہیں۔ حذیفہ' جویریہ کو راولپنڈی چھوڑ کر لندن سے دانش کی میت لاتا ہے اور اسمارہ کو شادی کا بتاتا ہے۔ اسمارہ اور رعنا بہت خفا ہوتی ہیں' عرشی نیم پاگل ہو جاتی ہے۔

مختار وڑائچ' حذیفہ کی غیر موجودگی میں جویریہ پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے۔ وہ عزت بچا کر بتول خالہ کے گھر پناہ لیتی ہے۔ بتول خالہ کا بیٹا منیر' جویریہ کو لاہور میں حذیفہ کے گھر لے کر آتا ہے۔

ناولٹ

سونیہ نوید

تجدید وفا

رعنا اور اسمارہ گاڑی میں گھر سے باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ جویریہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ حذیفہ کی بیوی ہے۔ وہ دونوں اس کو سخت سست کہہ کر گھر میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔ جویریہ مایوس ہو کر پلٹ آتی ہے۔
حذیفہ جویریہ کو تلاش کرتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ رعنا اسے بتاتی ہے کہ جویریہ گھر آئی تھی اور وہ حذیفہ سے جڑے رشتے کی قیمت لے کر چلی گئی ہے۔ اب واپس نہیں آئے گی۔ اسمارہ سخت شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ حذیفہ ان کی خوشی کی خاطر عرشی سے شادی کر لیتا ہے۔
مرنے سے پہلے اسمارہ حذیفہ کو جویریہ کے بارے میں سچ بتا دیتی ہے۔
جویریہ کو پتا چلتا ہے کہ بتول خالہ اور ان کا بیٹا منیر رعنا سے ملا ہوا ہے اور ان سے پیسہ لیتا ہے تو وہ گھر چھوڑ دیتی ہے اور ایک حادثے کے نتیجے میں پروفیسر صاحب کے پاس پہنچ جاتی ہے جو ایک فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں۔ وہ ماں بننے والی ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

رعنا کی مصروفیات کا دائرہ ہمیشہ کی طرح وسیع تھا۔ آج کل وہ ایک چیریٹی شو منعقد کروانے کے سلسلے میں مصروف تھیں، جس سے ہونے والی آمدنی کو یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔

شو کا اہتمام کافی بڑے پیمانے پر کیا جا رہا تھا۔ پبلسٹی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میوزک کی دنیا کے بڑے بڑے ناموں کو اسٹیج پر پرفارم کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ عرشی کو جب پتا چلا کہ اس کا فیورٹ بینڈ بھی اس کانسرٹ میں پرفارم کرنے والا ہے تو وہ جانے کے لیے مچل گئی۔

"میرا خیال ہے، تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔" رعنا نے اس سے کہا۔

یوں تو رعنا کو عرشی کو کبھی بھی کہیں لے کر جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا مگر اس بار اس کی حالت کے پیش نظر وہ تھوڑا تذبذب کا شکار تھیں۔

"آپ خواہ مخواہ کیوں فکر کرتی رہتی ہیں؟ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور پھر آپ بھی تو وہاں ہوں گی نا میرا خیال رکھنے کے لیے۔" عرشی نے لاڈ سے کہا۔

"حذیفہ کو پتا چلے گا تو وہ ناراض ہوگا۔" رعنا ہمیشہ کی طرح عرشی کی ضد کے آگے کمزور پڑنے لگیں تو حذیفہ کا نام لے کر اسے باز رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

عام طور پر حذیفہ بھی عرشی کو کہیں آنے جانے سے نہیں روکتا تھا مگر جب سے وہ امید سے ہوئی تھی، وہ بھی اسے زیادہ تھکا دینے والے کاموں سے منع کرنے لگا تھا۔

"ناراض تو وہ تب ہوگا جب اسے پتا چلے گا۔ وہ تو اسلام آباد گیا ہوا ہے۔" عرشی نے رعنا کا کمزور سا احتجاج ایک سیکنڈ میں رد کر دیا۔

"مگر عرشی!" رعنا اب بھی متذبذب تھیں۔

"پلیز ممی! پلیز۔" عرشی کی ضد کے آگے رعنا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میوزیکل ایوننگ کے سارے انتظام کی ذمہ داری رعنا کے ہاتھ میں تھی۔ شو دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آ رہے تھے۔

عرشی کے لیے رعنا نے سامنے والی قطار میں ایک آرام دہ کرسی رکھوا دی تھی جہاں سے وہ اسٹیج پر ہونے والے پروگرام سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتی تھی۔

رات اچھی خاصی گزر چکی تھی اور ابھی تک کسی ڈھنگ کے سنگر نے پرفارم نہیں کیا تھا۔ ابھی تک مختلف اور چھوٹے موٹے صداکار و گلوکار ہی اسٹیج کی خانہ پری میں مصروف تھے۔ عرشی اب بیٹھے بیٹھے تھکنے لگی تھی۔ رات کے بارہ بجے مشہور بینڈ کی آمد ہوئی تو مجمع میں شور مچ گیا۔

بینڈ کو پسند کرنے والوں میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی جن کا جوش و خروش قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

اس شو کو ٹی وی کے کسی مقامی چینل سے بھی ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ جگہ جگہ اسٹیج پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کے لیے اسٹینڈز کے اوپر لائٹیں اور کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ اسٹیج کے سامنے زمین پر بے شمار تاروں کے گچھے بکھرے پڑے تھے۔

بینڈ نے اپنے دو مشہور مگر لمبی تان والے گانوں کے بعد بھنگڑا کا آغاز کیا۔

ہجوم کو جوش آیا۔ لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تیز میوزک کی دھن پر کچھ منچلے نوجوان پچھلی سیٹوں سے اٹھ کر اسٹیج کے سامنے آ کر ناچنے لگے۔ بینڈ کے پیش کیے ہر نئے آئٹم پر میوزک پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گیا اور اسٹیج کے سامنے رش گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔

عرشی سب سے آگے والی نشست پر بیٹھی تھی مگر ان بے ہنگم طریقے سے اچھلتے کودتے لڑکوں کی وجہ سے اسے اسٹیج ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسلسل دائیں بائیں ہو کر دیکھنے کی کوشش میں سخت بدمزہ ہو رہی تھی۔ تب ہی ان ہلا گلا کرتے لڑکوں میں سے کسی ایک کا پاؤں زمین پر پڑے تاروں میں الجھا اور وہ اپنا توازن کھو کر دوسرے سے جا ٹکرایا اور دوسرا تیسرے سے، یہاں تک کہ جھومتے لڑکوں کا ایک پورا ٹولہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرف کو آ گرا، جہاں عرشی بیٹھی ہوئی تھی۔

عرشی کے منہ سے نکلنے والی دل دوز چیخ تیز میوزک کے شور میں ہی کہیں دب گئی۔

لڑکے آدھے منٹ کے اندر اٹھ کھڑے ہوئے مگر عرشی کرسی سمیت وہیں زمین پر پڑی رہی۔

آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں نے عرشی کے بے سدھ وجود کو ہلا جلا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رعنا خدا جانے کہاں سے دوڑتی ہوئی آئیں۔

عرشی کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بے ہوش عرشی کو گاڑی میں ڈال کر وہ گولی کی رفتار سے کلینک کی جانب روانہ ہوئیں۔ ڈاکٹر کو انہوں نے راستے میں ہی فون پر مطلع کر دیا۔ ان کے کلینک پہنچنے تک ڈاکٹر بھی وہاں آ پہنچی تھی۔

کلینک کا عملہ عرشی کو فوراً "آپریشن تھیٹر" میں لے گیا اور آپریشن تھیٹر کے باہر شدید خوف و ہراس میں مبتلا رعنا اس کی سلامتی اور زندگی کی دعائیں مانگنے لگیں۔

رات کے جانے کس پہر عرشی نے آنکھوں پر گرے بھاری پپوٹوں کو بمشکل اٹھایا تو کمرے کی سفید چکنی دیوار اور اس پر سے منعکس ہوتی ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح سے چبھی۔ اس نے کچھ بھی دیکھنے کی کوشش ترک کرتے ہوئے آنکھیں واپس موند لیں۔

عرشی کا ذہن پوری طرح سے بیدار نہیں تھا مگر پھر بھی اسے کمرے میں اور لوگوں کی موجودگی کا احساس ان کی دھیمی دھیمی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آواز رعنا کی اور دوسری یقیناً "ڈاکٹر" کی تھی۔ عرشی کو اس وقت جاگنے کی کوشش کرنا بے حد کٹھن کام لگ رہا تھا۔ اس نے بیدار ہونے کی کوشش ترک کرتے ہوئے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

صبح جب عرشی کی آنکھ کھلی تو رعنا ایک چھوٹا سا بچہ اس کے پہلو میں لٹا رہی تھیں۔

وقت کا پتا نہیں تھا لیکن کھڑکی سے اندر آتی دھوپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھا خاصا دن چڑھ چکا ہے۔

"ممی! یہ...؟" عرشی نے نہایت کمزور آواز میں حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ تمہاری بچی ہے جسے تم نے رات میں جنم دیا ہے۔" رعنا نے جواب دیا۔

"لیکن میرا بچہ تو بچ نہیں سکا تھا۔" عرشی کے منہ سے نکلا۔ بچی کے اطراف تکیہ پھنساتی رعنا نے ایک

دم سر اٹھا کر عرشی کو دیکھا۔
"میں نے رات کو آپ کی اور ڈاکٹر کی باتیں سن لی تھیں۔" عرشی نے رعنا کی نظروں سے خائف ہو کر بتایا۔
عرشی کی بات سن کر رعنا کے چہرے پر شکست کے آثار نمودار ہوئے۔ عرشی سے زیادہ اس آنے والے بچے کی منتظر وہ خود تھیں۔ رات کے سانحے کے بعد ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔
"تو تمہیں پتا لگ چکا ہے۔" رعنا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ فی الحال اس بچی کو اپنے ساتھ لٹا لو۔ میں نے ڈاکٹر سے سارے معاملات طے کر لیے ہیں۔ کسی کو کچھ خبر نہیں ہوگی۔"
"مگر یہ ہے کون؟ آپ اسے لائی کہاں سے ہیں؟" عرشی نے اٹھ کر بیٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ خود کو بستر سے ایک انچ بھی اوپر اٹھا سکتی۔
انہوں نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور کمر کے پیچھے تکیے رکھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔
اتنی سی مشقت سے ہی وہ بے دم ہو گئی۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔
"بنتو کے جاننے والوں میں سے کسی کی بچی ہے۔ لاوارث ہی سمجھو۔ ماں پیدا کرتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ باپ کا پہلے ہی پتا نہیں تھا۔ رشتہ داروں میں سے کوئی بھی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھا اس لیے تھوڑے سے پیسوں کے عوض خوشی خوشی اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہو گئے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط برتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ بچی کون اور کہاں لے کر گیا ہے۔ اس لیے بے فکر رہو۔ کبھی کوئی اس کا پوچھنے نہیں آئے گا۔" رعنا نے عرشی کو بچی کی دستیابی کی مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔
"اوہ نو۔ نوکرانی کی رشتہ دار؟" عرشی کو ننھی سی جان سے گھن آئی۔
عرشی نے ساتھ لیٹی بچی سے کھسک کر پرے ہونے کی کوشش کی جیسے بچی چھونے سے غریبی کے جراثیم اسے بھی لگ جائیں گے۔
"اسے لوٹا دیجیے ممی۔ مجھے کوئی بچہ وچہ نہیں چاہیے۔"
"بے وقوفی کی باتیں مت کرو عرشی!" رعنا اس پر بگڑیں۔
"بے وقوفی کی بات تو آپ کر رہی ہیں۔" کمزوری کے باوجود عرشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "نجانے کہاں سے اسے اٹھا کر لے آئی ہیں۔ میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ آپ اسے فوراً واپس لے جائیں۔"
"تم جانتی ہو نا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔" رعنا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"ہاں جانتی ہوں۔ میرا بچہ زندہ نہیں بچ سکا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کسی کا بھی بچہ اپنی گود میں ڈال کر بیٹھ جاؤں۔" عرشی نے وجود میں اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے بپھر کر کہا۔
رعنا کچھ دیر لب بھینچے عرشی کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔
"مجھے نہیں معلوم کہ رات میرے اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کتنا حصہ تم نے سنا اور کتنا نہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اس بات چیت کا ایک بہت اہم نکتہ تمہارے گوش گزار ہونے سے رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تم انتہائی بری حالت میں یہاں لائی گئی تھیں کل رات نہ صرف تم اپنے ہونے والے بچے کو کھو چکی ہو بلکہ تمہارے آئندہ ماں بننے کے امکانات بھی ختم ہو چکے ہیں۔"
رعنا نے بھاری ہوتی آواز کے ساتھ عرشی کو بتایا تو اسے پہلی بار اپنے وجود میں پھیلے خالی پن کا بری طرح احساس ہوا۔
یہ سچ ہے کہ عرشی شادی کے بعد اتنی جلدی بال بچوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن رعنا کے سمجھانے پر وہ اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھی اور

اب اس نے ذہنی طور پر خود کو ماں بننے کے لیے تیار کر لیا تھا تب یہ سن کر کہ وہ کبھی ماں کے مرتبے پر فائز نہیں ہو پائے گی اسے واقعی دھچکا لگا۔
"میں تمہیں یہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔" عرشی کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر رعنا نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ "اس وقت تم اس بچی کو اپنا کر حذیفہ کی نظروں میں سرخرو ہو سکتی ہو۔ آج کے بعد تمہیں ایسا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"
عرشی چپ رہی۔ اس نے جو کچھ سنا اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا۔
"دیکھو! جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔ اس بچی کو اپنے برابر لٹا لو۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ پہنچنے والا ہے۔ اسے کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔"
عرشی کی خاموشی میں رضامندی کا عنصر پا کر رعنا نے ایک بار پھر بچی کو عرشی کے نزدیک کیا۔
رعنا کے ایسا کرنے پر عرشی نے پہلی بار نظر اٹھا کر ساتھ لیٹی بچی پر ڈالی۔
گلابی کمبل میں لپٹی روئی کے گالوں جیسی نرم و نازک بچی واقعی دل موہ لینے کی حد تک معصوم اور پیاری تھی۔
پر وہ بھی عرشی تھی۔ اتنی جلدی کیسے پسیج جاتی۔
"ممی! آپ کو لانا ہی تھا تو لڑکا لے کر آتیں۔ جب جھوٹ ہی بولنا ہے تو پھر اس جھوٹ سے پورا فائدہ حاصل کرتے۔" عرشی نے کہا۔
شاید اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ بیٹے کی ماں بن کر وہ حذیفہ کی نظروں میں زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔ ماڈرن زمانے کی پڑھی لکھی عرشی کے ذہن میں اس وقت یہ پرانی مڈل کلاس سوچ نجانے کہاں سے آ گئی۔
"بے وقوف لڑکی!" رعنا ایک جلال میں آ گئیں۔ "بچے کیا دکانوں پر بکتے ہیں جو جا کر اپنی مرضی کا اٹھا کر لے آتی؟"
"میرا مطلب تھا کسی یتیم خانے سے۔" رعنا کو اس طرح غصے میں آتا دیکھ کر عرشی تھوڑا سا دبک گئی۔
"دنیا کا کون سا ایسا یتیم خانہ ہے جو چند گھنٹے کا نوزائیدہ بچہ راتوں رات تمہارے ہاتھ میں تھمانے لگے۔ بچے کو اڈاپٹ کرنے کے لیے کتنی لمبی قانونی کارروائی کرنی پڑتی ہے، کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟" رعنا ایک بار پھر گرجیں۔
"تو اسے پکڑو اور فیڈ کراؤ۔"
رعنا نے سوئی ہوئی بچی کو جو اب انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے کی تیاری کر رہی تھی بستر سے اٹھا کر عرشی کی گود میں ڈالا۔ بچی تھوڑی کمزور تھی۔ یہ بھی عرشی کے حق میں اچھا تھا۔ اس کی اپنی ڈلیوری میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ ایک قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے کے طور پر وہ بچی بالکل موزوں تھی۔
عرشی جو اپنے آپ کو ایک لے پالک بچے کو اپنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔ رعنا کی یہ نئی ہدایت سن کر بالکل ہی بدک گئی۔
"واٹ؟ میں اور اسے فیڈ کراؤں۔ نو وے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ دودھ پلانے کا ارادہ تو اس کا خود کے بچے کو بھی نہیں تھا، پھر اس بچی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
"ممی! آپ کہتی ہیں تو میں اسے رکھ لیتی ہوں، لیکن میں اسے فیڈ بالکل نہیں کراؤں گی۔ آپ اس کے لیے اوپر کے دودھ کا بندوبست کیجیے۔" عرشی نے رکھائی سے کہا۔
بچی ابھی تک اس کی گود میں پڑی تھی۔ اچانک عرشی کو اپنے اوپر تیزی کے ساتھ پھیلتے گیلے پن کا احساس ہوا۔
"اوہ گاڈ! اس بچی نے مجھے سارا گندا کر دیا۔ اٹھائیے اسے۔" عرشی نے بچی کو خود سے پرے دھکیلا۔
"کم از کم مجھے دینے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتیں کہ اس کا ڈائپر ٹھیک سے بندھا ہے یا نہیں۔" عرشی کو سخت غصہ آ رہا تھا۔
رعنا نے چپ چاپ بچی کو اٹھا کر بنتو کے حوالے

کردیا' جو اس کے کپڑے تبدیل کرنے لے گئی۔

تھوڑی دیر میں حذیفہ بھی پہنچ گیا۔

"حد ہو گئی خالہ! آپ کو مجھے رات کو ہی اطلاع کر دینی چاہیے تھی۔" وہ ناراض ہو رہا تھا۔

"بس بیٹا! سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔" رعنا اس سے نظریں چرائے کہہ رہی تھیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو بچی بستر کے ساتھ رکھی کاٹ میں سو رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" وہ پہلے عرشی کے پاس آیا پھر عرشی سے مثبت جواب پاکر کاٹ کی طرف مڑا۔

بچی پر نظر پڑتے ہی جو چمک حذیفہ کے چہرے پر آئی تھی اس نے عرشی کو رعنا کے اس تیز رفتار اور دور اندیش قدم کا قائل کردیا۔ رعنا نے حذیفہ اور عرشی کے رشتے میں اس بچی کو لاکر ایسی مضبوط گرہ باندھی تھی کہ ساری دنیا کی جوریائیں بھی آجائیں تو اسے نہ کھول سکتی تھیں۔

اس بچی نے صرف چند لمحوں میں وہ کردیا جو عرشی اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک نہیں کرپائی تھی۔ اس نے حذیفہ کا دل اپنے قبضے میں کرلیا۔

پہلی بار جوریہ نامی بلا کا خوف عرشی کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکلتا محسوس ہوا۔

"اب دیکھتی ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔" عرشی نے بچی کے ماتھے کو پیار سے چومتے حذیفہ کو دیکھ کر مطمئن انداز میں سوچا۔

بچی واقعی بہت پیاری تھی اور دن بدن اور بھی پیاری ہوتی جارہی تھی۔ حذیفہ نے اس کا نام ہنیہ رکھا۔

ہنیہ زیادہ تنگ کرنے والی بچی نہیں تھی۔ فیڈ کراکے کاٹ میں ڈال دو تو گھنٹوں خود ہی پڑی کھیلتی رہتی۔

وہ تیزی کے ساتھ بڑی ہو رہی تھی اور اس کے بڑھنے کے ساتھ اس سے جڑی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

رعنا نے ہنیہ کو سنبھالنے کے لیے فل ٹائم آیا کا بندوبست کردیا تھا۔ ہنیہ کو نہلانا' دھلانا' کھلانا' پلانا سب آیا کے فرائض میں شامل تھا۔ عرشی کا کام فقط اسے گود میں بھر کر کلینک سے گھر تک لانا تھا' جو وہ کرچکی تھی اور اب ہر قسم کی فکر و ذمہ داری سے آزاد ہوکر اپنی پرانی روٹین پر واپس لوٹ چکی تھی۔

لیکن حذیفہ کی زندگی میں ہنیہ کے آنے سے بہت بدلاؤ آگیا تھا۔ ہنیہ چست بچی تھی۔ جب بیٹھ نہیں سکتی تھی تب بھی ٹانگیں مار کر خود پر سے کمبل اتار دیتی اور چھوٹی سی کاٹ میں گھوم کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔ اے سی والے کمرے کے خنک و خوشگوار ماحول میں آیا کاٹ کے برابر بچھے اپنے بستر پر بے سدھ پڑی خراٹے لیتی رہتی۔ حذیفہ ہی راتوں کو بار بار اٹھ کر اسے جاکر کمبل اوڑھا کر آتا۔ اس کے اس دیوانے پن پر عرشی کو ہنسی آتی۔

جیسے جیسے ہنیہ بڑی ہوتی گئی' حذیفہ کی وارفتگی میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ عرشی کو چڑ ہونے لگی۔ اپنا بچہ ہوتا تو اور بات تھی مگر ایک غیر کے لیے حذیفہ کے دل میں اتنی محبت کا پنپنا عرشی کو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

ہنیہ بھی حذیفہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ سارا دن بابا' بابا کی گردان لگائے رکھتی۔ اس نے ہر وہ کام کرنا ہوتا تھا جو حذیفہ کرتا تھا۔ ہر بات میں وہ حذیفہ کی کاپی کرنے کی کوشش کرتی۔

حذیفہ کو چیز سلائس پسند تھا تو ہنیہ کو بھی وہی چاہیے ہوتا۔ حذیفہ ناشتے کے ساتھ اورنج جوس پیتا تھا تو ہنیہ بھلا کچھ اور کیسے لے سکتی تھی۔ حذیفہ کی عادت تھی کہ وہ کولڈ ڈرنک کی بوتل یا گلاس میں سے آخری دو گھونٹ ہمیشہ چھوڑ دیتا تھا تو ہنیہ بھی ناپ کر دو ہی گھونٹ بچاتی۔ یہاں تک کہ اس نے پہلی بار جب اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں پنسل پکڑی تو حذیفہ کی دیکھا دیکھی سیدھے کے بجائے الٹے ہاتھ میں تھامی۔

رفتہ رفتہ یہ چھوٹی اور معمولی باتیں بھی عرشی کی برداشت سے باہر ہونے لگیں۔

"آپ نے یہ کیسی مصیبت لاکر میرے گلے میں ڈال دی ہے۔ حذیفہ کو ہنیہ کے سوا کچھ دکھتا ہی نہیں۔ میں تو جیسے ان دونوں کے درمیان ہو کر بھی وہاں نہیں ہوتی۔ اس سے تو بے اولاد ہی بھلے تھے۔"

عرشی نے رعنا کے سامنے دل کی بھڑاس نکالی جو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ساڑھی کی فال درست کررہی تھیں۔ انہیں تھوڑی دیر میں کسی فنکشن میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ وہ اس وقت عرشی کے ساتھ اس ذاتی قسم کے پرابلم پر لمبی چوڑی بحث کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھیں۔

"تم خواہ مخواہ ہر بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔ اگر حذیفہ اس بچی سے پیار کرتا ہے تو کرنے دو۔ تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے۔" رعنا نے لاپروائی سے کہا۔

عرشی کو ہمیشہ سے ہی ہر اس شخص کا وجود کھٹکتا تھا جو تھوڑی دیر کے لیے بھی حذیفہ کی توجہ اس پر سے ہٹا کر اپنی طرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب اسماء جیسی سگی خالہ ہونے کے باوجود عرشی کی اس جلن سے مستثنیٰ نہ ہوسکیں تو پھر ہنیہ تو واقعی غیر تھی۔

"ممی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔ وہ لڑکی میری آنکھوں میں چبھتی ہے۔" عرشی نے کہا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہ ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے ہی موجود ہوتی ہے۔" رعنا کو معلوم تھا کہ عرشی کن کن طریقوں سے ہنیہ کو خود سے دور رکھا کرتی تھی۔

"وہ میری نظروں کے سامنے نہ بھی ہو تو اس کی موجودگی کا احساس تو ہر وقت رہتا ہی ہے۔ میرے بہترین ڈیکور والے گھر میں جس کی لوگ مثالیں دیتے نہیں تھکتے تھے اب جگہ جگہ ہنیہ کی کلر پنسلیں' اس کے بلاکس اور پتا نہیں کیا کچھ بکھرا پڑا رہتا ہے۔ اتنی بار آیا سے کہا ہے کہ اسے کھلونے نرسری سے باہر نہ لانے دیا کرے مگر اس عورت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ ایک نمبر کی کام چور ہے وہ۔ سارے نوکر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تنخواہ لیتے وقت حاضر اور کام کے وقت غائب۔" عرشی سخت تپی ہوئی تھی۔

"عرشی بیٹا! چھوٹے بچوں والے گھر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" ہمیشہ کی طرح رعنا نے نرمی سے سمجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"مگر مجھے اپنے گھر میں ایسا کچھ نہیں چاہیے۔" عرشی چلائی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رعنا کی اسے پرسکون کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔

"ایک تو میں اسے حذیفہ کے سامنے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اسی نے ہنیہ کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" عرشی کے برعکس رعنا بالکل مطمئن تھیں۔

"اگر وہ حذیفہ کی کمزوری بن چکی ہے تو یہی وہ موو ہے جس کے بل پر تم ساری زندگی حذیفہ کے گھر پر راج کرسکتی ہو۔ حذیفہ جیسے جذباتی مرد کے لیے اولاد کتنی بڑی زنجیر ہوتی ہے اس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔"

رعنا نے عرشی کو سمجھایا تو وہ خاموش ہوگئی۔ حذیفہ کی جذباتیت سے وہ خود بھی واقف تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے پر اس لڑکی کو برداشت کرنا میرے لیے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ پلیز کچھ کیجیے کوئی حل ڈھونڈیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔" عرشی نے کہا۔

"ریلیکس عرشی! اگر نہیں برداشت ہوتا تو اسے ہاسٹل بھجوادو۔ اس میں اتنا ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

رعنا نے اپنا آپ تنقیدی نظروں سے آئینے میں دیکھتے ہوئے ایک بار پھر لاپروائی سے کہا۔

وہ اس معاملے میں زیادہ متفکر نہیں تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ عرشی کو رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت ہے۔ ان کے حساب سے ہنیہ کا مسئلہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ اس طرح پریشان ہوا جائے۔

"اچھا سنو! میں ایک فیشن شو میں جا رہی ہوں۔ چلوگی میرے ساتھ؟ موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا تمہارا۔"

رعنا نے آخر کار آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے عرشی سے پوچھا۔

"نہیں! آپ جائیے۔ میں اب گھر جاؤں گی۔" عرشی نے جواب دیا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ عرشی کوئی فنکشن چھوڑ دے۔ وہ فیشن کی دلدادہ تھی اور جدید فیشن کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ رکھنا اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ پر فی الحال وہ کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اس کے ذہن میں رعنا کا ایک ہی فقرہ گھوم رہا تھا۔

"ہنیہ کو ہاسٹل بھجوا دو۔"

☼ ☼ ☼

عرشی کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ حذیفہ اس تجویز پر بالکل راضی نہیں ہوگا۔ اور یہی ہوا۔ وہ بات سنتے ہی بری طرح بھڑک گیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے۔" عرشی برا مان کر بولی۔

"میں ہنیہ کی بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔ دیکھو نا۔ وہ دن بدن کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی جا رہی ہے۔ بورڈنگ میں جا کر وہ تھوڑا ڈسپلن سیکھ لے گی۔" عرشی نے کہا۔

"تم بھی تو ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ تو کیا تمہیں بھی ڈسپلن کے لیے بورڈنگ بھجوا دینا چاہیے؟" حذیفہ نے ترخ کر کہا۔ عرشی جز بز ہو گئی۔ پھر جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ یہ معاملہ گرمی کھا کر حل ہونے والا نہیں تھا۔

"دیکھو! یہ ہنیہ کی بھلائی کا معاملہ ہے۔" عرشی نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کی۔

"مجھے تو ایک چھوٹی سی بچی کو اپنے گھر اور گھر والوں سے دور کر دینے میں اس کا کوئی بھلا نظر نہیں آتا۔ ہنیہ تھوڑی سی شرارتی ضرور ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے سزا کے طور پر بورڈنگ اسکول بھجوا دیا جائے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بورڈنگ اسکول نہ ہوا جیل ہو گئی جہاں سزائیں دی جاتی ہیں۔"

"میرے حساب سے وہ جگہ جیل کے ہی برابر ہے جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے ماں باپ سے دور کر کے رکھا جاتا ہے۔"

حذیفہ قطعی لہجے میں بولا تو عرشی زچ ہو گئی۔ اتنا اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا کہ حذیفہ آرام سے کبھی نہیں مانے گا۔ عرشی نے اپنے اندر ابھرتی جھنجلاہٹ کو چھپا کر حذیفہ کو نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"دنیا میں کتنے ہی بچے ہاسٹل میں جا کر رہتے ہیں۔ کچھ تو اچھا ہوگا ان اسکولوں میں جو لوگ اپنے بچوں کو وہاں بھجواتے ہیں۔" عرشی نے کہا۔

"بھجواتے ہوں گے پر ہنیہ نہیں جائے گی۔"

"لیکن۔"

"بس۔" اس نے عرشی کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"میں نے کہہ دیا کہ ہنیہ نہیں جائے گی تو نہیں جائے گی۔ اب ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔"

حذیفہ یہ کہہ کر چلتا بنا اور وہ وہیں کھڑی دانت پیستی رہ گئی۔

حذیفہ اکثر عرشی کی الٹی سیدھی فرمائشوں کو بلا چوں چراں مان کر اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا تھا کہ وہ اس سے کچھ بھی منوا سکتی ہے پر اس قسم کے موقعوں پر عرشی کو بڑی شدت سے احساس ہوتا تھا کہ حذیفہ صرف ان باتوں کو مانتا ہے جو اس کی نظر میں ——— ——— غیر اہم ہوتی ہیں۔ اتنی غیر اہم کہ وہ ان سے انکار کر کے عرشی کے ساتھ بحث کرنے کی زحمت کرنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا اور جو باتیں اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں ان پر عرشی سر توڑ کوشش کر لینے کے باوجود اسے ٹس سے مس نہیں کر سکتی تھی۔

پر عرشی بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بچپن سے اپنی منوانے کی جو عادت پڑ گئی تھی وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ دو چار دن بعد اس نے پھر بات چھیڑ دی۔ حذیفہ ناشتے کی ٹیبل پر تھا۔

"ہنیہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ایسا کون سا بورڈنگ اسکول ہے جو اتنے چھوٹے بچے کو ایڈمیشن دیتا ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

جواب میں عرشی نے اسکول کے فارم سامنے ٹیبل پر رکھ دیے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ ہنیہ کے داخلے کے لیے معقول اسکول تلاش کرنے کے لیے عرشی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ وہی جانتی تھی اور اب اس کی ساری تفصیلات سے لیس ہو کر حذیفہ کے سامنے یہ مقدمہ پھر سے لے کر آئی تھی۔

"ہنیہ اب اتنی چھوٹی نہیں رہی۔ پورے چھ سال کی ہو چکی ہے وہ۔ یہی عمر ہوتی ہے بچے کی بنیاد کو مضبوط کرنے کی۔" عرشی نے رسان سے کہا۔

"تمہیں اچانک اس کی بنیاد میں کیا کمی نظر آ گئی؟ شہر کے بہترین اسکول میں پڑھ رہی ہے وہ۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس کی بنیاد کمزور ہے تو تم اسے مضبوط بنانے کے لیے جتنے ٹیوٹر رکھنا چاہتی ہو رکھ لو۔ اس میں اگر ڈسپلن کی کمی محسوس ہوتی ہے تو کوئی بھی گورنس، نینی یا جو کچھ بھی ہو اس کے سر پر بٹھا دو مگر جو کچھ کرنا ہے یہیں کرو۔ ہنیہ ہاسٹل ہرگز نہیں جائے گی۔"

حذیفہ اپنا فیصلہ سنا کر ابلا ہوا انڈا کھانے لگا۔ عرشی کی جان جل گئی۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے آخر۔ میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیسے نہیں جاتی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"میں اپنی بیٹی کو خود سے الگ نہیں کر سکتا۔" حذیفہ نے بیچ میں چیخ دیا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔ عرشی کے اندر باہر لاوا دہک گیا۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر اس کے دل دماغ کو جھلسانے لگے۔

"وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔" وہ غصے سے بے قابو

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے اک کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

ہو کر چلائی۔
عرشی کی سب سے بڑی خامی یہی تھی۔ اسے خود پر، اپنے جذبات پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔
ہاتھ سے نکلے وقت اور زبان سے ادا ہوئے الفاظ دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی واپس موڑا جا سکتا تو عرشی یہ کر گزرتی، پر اس وقت اس کے پاس رکی سانسوں کے ساتھ وہاں کھڑے ہو کر حذیفہ کے رد عمل کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔
"میں جانتا ہوں۔" حذیفہ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا۔ شاک کے مارے عرشی اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔
"تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں کا منہ بند کر دینے سے اتنی بڑی بات چھپی رہ سکتی ہے؟" حذیفہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔
"تم... کب سے جانتے ہو۔" عرشی نے سوکھے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔
"جب سے تم جانتی ہو۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ "جس کلینک میں تمہاری ڈلیوری ہوئی، وہاں ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ جو اپنے ایک کیس کے سلسلے میں اس رات وہیں موجود تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ مجھے فون پر بتا چکا تھا کہ بچے کو بچایا نہیں جا سکا اور بال..."
"میں اس لیے چپ رہا کہ چلو تمہارے اس جھوٹ سے اگر تمہاری سونی گود بھرنے کے ساتھ کسی لاوارث کو گھر مل رہا ہے تو کیا برا ہے۔ مگر عرشی! تم نے اس ننھی سی روح کو اپنی جھولی میں لیا ضرور، پر کبھی اسے اپنا نہ سکیں۔ جب تم نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اسے کم از کم نبھا تو سکتیں۔ اگر اس بچی کو محبت کے ساتھ تھوڑا سا پیار بھی دے دیتیں تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ خاص طور پر جب تمہیں معلوم ہے کہ تم خود کبھی ماں نہیں بن سکو گی، لیکن مجھے تم سے یا تقدیر سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے ہنیہ ہی کافی ہے۔" وہ میز سے اٹھ کر عرشی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
عرشی کا قد ہیل کے بغیر حذیفہ کے کندھے تک پہنچ رہا تھا اور آج اس کی نظریں حذیفہ کی شرٹ کے کالر سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔
"ایک بات کان کھول کر سن لو عرشی!" حذیفہ نے وارننگ دینے والے انداز میں سامنے کھڑی عرشی سے کہا۔ "آج کے بعد یہ کہنے کی غلطی دوبارہ بھی مت کرنا کہ ہنیہ میری بیٹی نہیں ہے۔"

✲ ✲ ✲

عرشی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنا پرس سامنے والی میز پر پھینکا اور اپنے پیر سفید اور نیلے تسموں سے مزین ہیل کی جوتی سے باہر نکالے۔ یہ سینڈل ان ہیلز میں سے تھی جنہیں فیشن کی خاطر بس تھوڑی دیر کے لیے پہنا جاتا ہے جبکہ عرشی انہیں پہن کر کئی گھنٹے بازار میں گھومتی رہی تھی اور اب اپنے پیروں پر پڑنے والے لال نشانوں کو دیکھ رہی تھی جو پتلی پتلی پٹیوں کی وجہ سے وہاں عارضی طور پر نمودار ہو گئے تھے۔ جھکی ہوئی عرشی کے خوبصورتی سے تراشے بال آگے ہو کر چہرے کے ارد گرد سے گزرتے ہوئے اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔
عرشی کے بالوں کا قدرتی رنگ گہرا براؤن تھا، جسے عموماً "سیاہ ہی" سمجھا جاتا ہے اور وہ بھی کچھ ایسا برا رنگ نہیں تھا، پر عرشی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت جلد یکسانیت سے اکتا جاتی تھی۔ اب چاہے وہ یکسانیت زندگی میں ہو یا پھر فیشن میں۔ اچانک عقب سے آتی چھناکے کی آواز نے اسے ہڑبڑا کر سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ باہر ہال میں یقیناً کچھ ٹوٹا تھا۔

ہال کے دروازے سے ہی عرشی کو ایک نظر میں ہی سب دکھائی دے گیا۔
ایک کونے میں زمین پر بکھرے کرسٹل کے گلدان کے ٹکڑے سمیٹتی رشیدہ اور اس کے پاس ربڑ کا بڑا سا بال ہاتھ میں لیے مجرم بنی کھڑی ہنیہ۔
عرشی کا خون کھول گیا۔ وہ یہ گلدان اپنے یورپ کے

ٹرپ کے دوران اٹلی سے خرید کر لائی تھی۔ وہ کہاں سے لایا تھا اور کتنے کا آیا تھا یہ الگ بات تھی، اسے طیش دلانے کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے ٹوٹنے میں ننھی سی ہنیہ کا ہاتھ ہے۔
"یہ تمہارے کھیلنے کی جگہ ہے کیا؟" عرشی نے آگے بڑھ کر ہنیہ کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔
"ہزار بار کہا ہے کہ نرسری کے اندر رہ کر کھیلا کرو۔" عرشی نے چلا کر کہا۔
ہاتھ نچا نچا کر چنگھاڑتی ہوئی عرشی اس وقت اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود انتہائی بھیانک لگ رہی تھی۔

ہنیہ چپ چاپ بال ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اتنی سی عمر میں ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ جہاں وہ حذیفہ کی آنکھ کا تارا ہے، وہیں عرشی کا موڈ اس پر نظر پڑتے ہی خراب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ خود کو اپنے بیڈ روم سے ملحق نرسری تک محدود رکھنے کی عادی بنا چکی تھی۔ گھر کے اس کمرے کو خاص حذیفہ کی ہدایت کے مطابق اور اس کی نگرانی میں تب نرسری میں تبدیل کیا گیا تھا جب ہنیہ نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا شروع ہی کیا تھا۔ بے بی پنک کلر کی دیواروں والی اس نرسری میں اسٹفڈ ٹوائے اور گڑیوں سے لے کر بے شمار چھوٹے بڑے گیمز ہنیہ کے کھیلنے کے لیے موجود تھے۔
مگر یہ کمرا چاہے کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو۔ آخر تھا تو چار دیواری اور چھت والا ایک کمرا ہی! ہنیہ جیسی ذہین اور چلبلی بچی کے لیے سارا دن اس کمرے میں بند ہو کر گزارا کرنا بہت مشکل تھا، اسی لیے اس نے رشیدہ سے باہر لان میں جا کر کھیلنے کی فرمائش کی تھی۔
یہ سمجھ کر کہ عرشی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے، رشیدہ نے بھی اس کی بات مان لی۔ ہنیہ نے باہر جانے کے لیے ہال میں سے گزرتے وقت ہاتھ میں پکڑی بال کو ہوا میں اچھال کر کیچ کرنا چاہا تو بال واپس ہاتھ میں آنے کے بجائے سائیڈ والی میز پر رکھے گلدان سے ٹکرا کر اسے زمین بوس کر گئی۔
"ممی! سوری۔ میں نے نہیں توڑا۔ غلطی سے ٹوٹ گیا ہے۔" ہنیہ نے عرشی سے کہا۔
"غلطی کی بچی! ہر روز کوئی نیا نقصان کر کے کہتی ہے کہ غلطی سے ہو گیا ہے۔" عرشی نے ہنیہ کو بازو سے دبوچ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
"ممی! میں روز نقصان نہیں کرتی اور آپ سے بھی تو پرسوں پلیٹ ٹوٹی تھی۔" ہنیہ نے بھی پلٹ کر جواب دیا۔ عرشی آگ بگولہ ہو گئی۔ عرشی کی ہنیہ سے چڑنے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے اتنے سخت رویے کے باوجود ہنیہ اس کے رعب میں نہیں تھی۔ وہ عرشی کی گرم مزاجی کی وجہ سے اس کے سامنے آنے سے گریز ضرور کرتی تھی مگر اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اس کی پروا نہ کرنے والی فطرت و عادات عرشی جیسی خود پسند اور رعونت بھری عورت کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔
"بکواس کرتی ہے، بجائے معافی مانگنے کے بکواس کرتی ہے میرے سامنے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح اسے جھنجھوڑ ڈالا۔
"پاپا... پاپا!" ہنیہ تکلیف سے بلبلائی۔ مصیبت میں اسے ایک ہی نام یاد آتا تھا۔
"چیخو اور زور سے چلاؤ۔ کوئی نہیں آئے گا تمہیں بچانے۔"
عرشی نے ہنیہ کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکے دیے تو ہنیہ کی فلک شگاف چیخیں سارے گھر میں گونجنے لگیں۔
"چپ کر منحوس!" عرشی نے بے دردی سے کئی تھپڑ اسے لگائے۔ چھ سال کی معصوم بچی عرشی کی جنونی گرفت میں بے بس تھی۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر خود کو عرشی کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مغلظات کا ایک طوفان تھا جو عرشی کے منہ سے جاری تھا جس کو سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک مہذب طبقے کی پڑھی لکھی عورت ہے۔
ایک کونے میں کرچیاں سمیٹتا بھول کر ہکا بکا بیٹھی

تھے۔ شاید بابا یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ننھیال سے انجان رہوں۔ لیکن یہ بابا کی ایک بے کار کوشش تھی کیونکہ ان لوگوں کو ہم سے جان پہچان بڑھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ سردیوں میں نانی صحن میں لکڑی کا تخت بچھوا کر اس پر دھوپ سینکا کرتی تھیں۔ مجھے بھی وہیں صحن کے کونے میں رکھی ایک پیڑھی پر بٹھالیا جاتا جیسے کسی کام والی ماسی کے اس بچے کو بٹھایا جاتا ہے جسے وہ کسی دن کام پر اپنے ساتھ لے آئی ہو۔

"خبردار' یہاں سے ہلنا مت۔" کا حکم ہمارے جاتے ہی صادر کر دیا جاتا اور ہمارے واپس آنے تک اس میں کسی قسم کی ترمیم کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

وہاں میری حیثیت واقعی کسی خدمت گار کی اولاد جیسی ہوتی کیونکہ جتنی دیر ہم وہاں رہتے' ماموں یا گھر کے کسی دوسرے فرد کو بابا کے ذمے لگانے کے لیے کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہتا۔

بابا جس دفتر میں نوکری کر رہے تھے وہاں وہ ایک مناسب عہدے تک پہنچ چکے تھے اور یہ چھوٹے موٹے نوکروں والے کام انہیں بالکل زیبا نہیں دیتے تھے پھر بھی بابا خاموشی سے ہر وہ کام کیے جاتے جن کا انہیں حکم ملتا۔

ننھیال میں گزارے چند گھنٹے میرے لیے عذاب ہوتے۔ وہاں میں اپنے ماموں زادوں کو کھیلتا تو دیکھ سکتی تھی مگر ان کے کھیل میں کبھی شامل نہیں ہو سکتی تھی۔

ننھیال سے یہ زبردستی کا میل ملاپ کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہی ہو گیا۔ کچھ میرے وہاں نہ جانا چاہنے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بابا کی سمجھ میں آگیا کہ وہ سب لوگ مجھے بابا کی بیٹی کے علاوہ اور کسی رشتے سے دیکھنے کو تیار ہی نہیں۔

بابا نے مجھے وہاں لے جانا بند کر دیا۔ خود اگر جاتے تھے تو مجھے خبر نہیں۔

پتا نہیں نانی کے انتقال کی خبر بھی بابا کو کس نے دی تھی۔ ماموں وغیرہ میں سے تو کوئی بابا کو اطلاع دینے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اگلے ہی پل اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

بابا نے الماری میں رکھی اپنی ڈائری سے ایک نمبر نکال کر اس پر کال ملائی۔ تھوڑی دیر میں بابا بڑے ماموں سے ان کی ماں کے انتقال پر افسوس کر رہے تھے۔ بات مختصر تھی۔ درمیان میں ایک آدھ بار' مگر وہ لیکن جیسے لفظ بھی آئے۔ پھر فون بند ہو گیا۔

بابا نے ڈائری واپس الماری میں رکھ کر اس کو لاک کیا اور چپ چاپ اپنے بستر میں آکر لیٹ گئے۔

پر میری نیند بالکل اڑ چکی تھی۔ میرا ذہن اس نہج پر سوچ رہا تھا جس پر آج سے پہلے کبھی میرا دھیان نہیں گیا تھا۔

میں لحاف میں سے منہ نکالے بابا کے پلنگ کے پیچھے کھڑی بڑی سی لکڑی کی الماری کو تک رہی تھی جس میں ایک ڈائری رکھی تھی ایسی ڈائری جس پر میرے بڑے ماموں کا پتا درج تھا۔ اس گھر کا پتا جہاں میری نانی رہا کرتی تھیں اور جہاں ان کا انتقال ہوا تھا۔ وہ گھر جہاں یقیناً" اپنی ماں کی میت پر آنسو بہانے اس وقت میری امی بھی آئی ہوں گی۔

صبح جب بابا آفس کے لیے تیار ہو رہے تھے تو میں نے الماری کھول کر ڈائری نکال لی۔ بابا اپنی الماری کی چابی کہاں رکھتے تھے اس بات کا مجھے بہت عرصہ سے پتا تھا۔ (پتا نہ ہوتا تو میں ان سے چھپ کر البم کیسے دیکھ سکتی تھی)

ماموں کا پتا نوٹ کر کے میں حسب معمول تیار ہو گئی۔ بابا آفس کے لیے نکلے اور میں گلی کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس وین میں سوار ہو گئی جو ہمیں روزانہ اسکول لے کر جاتی تھی۔

اسکول کے آگے رش ہونے کی وجہ سے وین والا ہمیں گیٹ سے تھوڑا پیچھے ہی اتار دیا کرتا تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ ہم لڑکیاں پیدل چل کر پار کر لیتی تھیں۔

اس دن میں نے اپنی چال دانستہ آہستہ رکھی اور سب سے پیچھے چلنے لگی۔ کسی نے غور نہیں کیا۔ ویسے بھی میری کسی لڑکی کے ساتھ اتنی دوستی نہیں تھی کہ وہ

میرے ساتھ چلنے یا نہ چلنے پر دھیان دیتی۔

باقی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی ہوئی اسکول کے اندر چلی گئیں اور میں چپکے سے ساتھ والی گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے دوسری طرف سے مین روڈ پر نکل کر میں نے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔

اس چھوٹے سے شہر میں چند ایک ہی قابل دید مقامات تھے اور میرے نانا کی آبائی حویلی بھی ان میں سے ایک تھی۔ رکشے والے کو پتا سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ چند ہی منٹوں میں اس نے مجھے ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسکول کے علاوہ کہیں اکیلی آئی تھی اور وہ بھی بابا کو بغیر بتائے' ان سے بنا اجازت لیے۔ خوف سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن اس خوف پر وہ خواہش حاوی تھی جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔

امی سے ملنے کی خواہش نے کب میرے اندر جڑ پکڑی۔ مجھے معلوم نہیں۔ شاید یہ خواہش ازل سے میرے ساتھ تھی بس مجھے پتا تب چلا جب ان سے ملنے کی موہوم سی امید نظر آئی۔

باہر کی چار دیواری میں لگا بڑا سا آہنی دروازہ ہی نہیں اندر حویلی کے تمام دروازے بھی تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔

ہر کمرے' ہر دالان میں کوئی موجود تھا۔

روتے ہوئے' آنسو بہاتے قریبی رشتہ دار' سیپارہ پڑھتے' گٹھلیاں گراتے دور کے قرابت دار اور یہاں وہاں دوڑتے پھرتے سب کی آوازوں پر لپکتے ہوئے حویلی کے ملازم۔

سب مصروف اور میرے لیے سب اجنبی لیکن وہ ایک مانوس چہرہ جسے میں ڈھونڈ رہی تھی' کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

تب ہی مجھے خیال آیا کہ بابا کے ساتھ میں جب کبھی بھی اس حویلی میں آئی تھی امی سے کبھی سامنا نہیں ہوا۔ غالباً" بابا اطلاع دے کر آتے تھے اور امی دانستہ ہمارے سامنے آنے سے گریز کرتی تھیں پر آج تو انہیں میرے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پھر آج وہ کہاں تھیں؟

میں ایک کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر انہیں تلاش کرتی رہی۔ کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ آخر میں کمروں سے نکل کر حویلی کے پچھلی طرف اس صحن میں آگئی جہاں نانی بیٹھا کرتی تھیں۔

نانی کا تخت وہیں صحن کے مغربی کونے میں رکھا تھا جہاں سردیوں میں سب سے اچھی دھوپ آتی تھی۔ اس کے اوپر سرخ گلاب کے پھولوں کے ڈیزائن والا صاف ستھرا تخت پوش بچھا تھا اور اس تخت پوش پر جو عورت کروٹ کے بل لیٹی تھی' اسے میں ہزاروں کے مجمع میں بھی آسانی سے پہچان سکتی تھی۔

سنا تھا کہ حسن سوگوار ہو تو اور بھی حسین ہو جاتا ہے۔ اس روز دیکھ بھی لیا۔

امی اپنی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت تھیں۔ ان کی آنکھیں متورم اور ناک سرخ ہو رہی تھی جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی روئی ہوں۔ اس وقت وہ نڈھال ہو کر تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک نوکرانی ان کے پیچھے بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

صحن اس وقت خالی نہیں تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے کئی لوگ اندر کمروں سے نکل کر باہر دھوپ میں آبیٹھے تھے۔

لیکن پھر نجانے کیسے صحن میں پھیلی دھوپ کی تپش سے خود کو گرماتے ڈھیروں رشتہ دار' ماحول اور حالات سے یکسر بے نیاز و لاپروا یہاں سے وہاں دوڑتے کھیلتے ان کے بچے' سب کہیں غائب ہو گئے۔ رہ گئے تو فقط دو افراد۔

میں اور میری امی۔

"امی۔" میں نے ان کے قریب جا کر ان کو پکارا تو انہوں نے اپنی موندی ہوئی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں

رشیدہ کو بھی عرشی کا یہ روپ دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"چھوڑیں جی! بے بی سے غلطی ہو گئی۔ معاف کردیں اسے۔"

رشیدہ نے آگے بڑھ کر ہنیہ کو عرشی کی گرفت سے آزاد کروانے کی کمزور سی کوشش کی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" غصے کی حالت میں عرشی رعنا کے قابو میں نہیں آیا کرتی تھی۔ رشیدہ تو پھر معمولی نوکرانی تھی۔ رشیدہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی کیونکہ وہ غریب تھی اور اپنی لگی بندھی روزی روٹی پر لات مارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

اب ہنیہ تھی اور عرشی کا قہر۔ چھڑانے والا کوئی نہ تھا۔ کم از کم عرشی کا یہی خیال تھا اور اس وقت تک رہا جب تک ہنیہ کے رخسار کی طرف بڑھتے ہاتھ کو اچانک کسی نے کلائی سے جکڑ نہ لیا۔

"بس کرو یہ تماشا۔"

عرشی کو اپنے برابر حذیفہ کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔ عرشی کی طرح وہ بھی خلاف معمول جلدی گھر آگیا تھا اور عرشی کی طرح ہی ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے کے منظر نے اس کا خون کھولا دیا تھا۔

"کیوں بس کروں۔ دیکھا نہیں اس نے کیا کیا ہے۔" عرشی نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی حذیفہ کی گرفت سے چھڑائی اور اس کی ٹانگوں کے پیچھے چھپی ہنیہ کو ایک بار پھر پکڑنا چاہا۔

"بس!" حذیفہ کی گرجتی آواز نے عرشی کو اپنی جگہ پر ساکت کردیا۔ رشیدہ بھی معاملہ بگڑتا دیکھ کر کب کی وہاں سے رفوچکر ہو چکی تھی۔

"تم ایک جنگلی اور وحشی عورت ہو۔ تم سے کسی اچھائی کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔" حذیفہ میں کمال کی قوت برداشت تھی۔ اتنے سالوں میں کئی ایسے مواقع آئے جہاں کوئی بھی انسان خود پر کنٹرول کھو سکتا تھا مگر حذیفہ نے ہمیشہ خود پر قابو رکھا مگر اس وقت وہ جس طرح طیش میں آیا تھا اسے دیکھ کر عرشی کو لگا کہ اگر اس نے اپنا ہاتھ فوراً نہ روک لیا تو آج حذیفہ کا ہاتھ بھی اس پر ضرور اٹھ جائے گا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار اسے حذیفہ کے غصے سے خوف محسوس ہوا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

کتنی دیر حذیفہ ہنیہ کے سسکتے وجود کو سینے سے لگا کر لان میں پھرتا رہا جیسے اپنی محبت سے اس نفرت کے اثر کو زائل کرنا چاہ رہا ہو۔ جو تھوڑی دیر قبل تھپڑوں کی صورت میں ہنیہ کے جسم پر وارد ہوئی تھی۔ حذیفہ کو معلوم تھا کہ جو کچھ ہوا اس کا ٹوٹے ہوئے ڈیکوریشن پیس سے کوئی تعلق نہیں۔ عرشی محض اپنی فرسٹریشن ہنیہ پر نکال رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر طوفان کھڑا کردینے والی۔ حذیفہ پر تو اس کا بس نہیں چلتا تھا البتہ ہنیہ کو دق کرنے کا کوئی بہانہ وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اور یہ سب حذیفہ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ہنیہ حذیفہ کی گود میں ہی روتے روتے سو گئی تھی۔ حذیفہ اسے لے کر اندر چلا آیا۔

عرشی کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ اس کے اس جنگلی پن کے مظاہرے کے بعد حذیفہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہنیہ کو اس کے بستر پر احتیاط سے لٹا کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سوئی ہوئی ہنیہ کو دیکھنے لگا۔ رونے کی وجہ سے اس کی پلکیں بھیگ کر ایک دوسرے سے چپکی ہوئی تھیں۔ گالوں پر ابھی تک عرشی کی بے رحم انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔

حذیفہ کتنی دیر ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا پھر جھک کر سوئی ہوئی ہنیہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

حذیفہ ساری رات اپنے کمرے میں نہیں آیا۔ عرشی جب صبح اٹھی تو بستر خالی پڑا تھا اور چادر بے شکن تھی۔ عرشی دونوں ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سمیٹتی بستر سے اترنے لگی تو اسے سائیڈ ٹیبل پر پڑا کاغذ نظر آیا۔

عرشی نے نیند سے بھری آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو یہ بورڈنگ اسکول کا ایڈمیشن فارم تھا جو پچھلے کئی دن سے کبھی یہاں تو کبھی وہاں پڑا رل رہا تھا۔

جس چیز نے عرشی کی آنکھیں پوری طرح سے کھول دیں وہ فارم کا نچلا اور آخری حصہ تھا جو کل تک خالی تھا۔ آج وہاں حذیفہ کے دستخط ہو چکے تھے۔

عرشی کو نہیں معلوم کہ حذیفہ نے کیا سوچ کر فارم پر دستخط کیے تھے۔

رات کو ہنیہ کو اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ کتنی دیر باہر لاؤنج میں ٹہلتا رہا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ عرشی اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے بے رحمی کی کسی بھی حد کو پار کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔ جب سے ہنیہ کی اصلیت کو حذیفہ سے چھپا کر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی تب سے عرشی کا رہا سہا لحاظ بھی جاتا رہا۔ کبھی کبھی حذیفہ کو لگتا تھا کہ یہ وہ عرشی ہے ہی نہیں جسے وہ شادی سے پہلے جانتا تھا۔

یا پھر شاید وہ اسے کبھی جانتا ہی نہیں تھا۔ حذیفہ نے باہر دیکھتے ہوئے تھک کر سوچا، جہاں رات کی تاریکی صبح کی نیلگوں سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی۔

باہر لان میں مالی کے لگائے پودوں پر ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ دنوں میں ان ننھی اور نازک کلیوں نے خوش رنگ اور خوش نما پھولوں کا روپ دھار لینا تھا مگر کونپل سے پھولوں تک کے سفر میں انہیں ماہر ہاتھوں کی محنت کی ضرورت تھی، جو محبت اور توجہ کے ساتھ ان کی آبیاری کرتے۔

بچے بھی ان ننھی کلیوں کے جیسے نرم و نازک ہوتے ہیں جنہیں کھلنے کے لیے اتنی ہی توجہ، محنت اور محبت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن جس گھر میں محبت کی جگہ نفرت بٹنے لگے وہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہتا۔

حذیفہ کو آج بھی وہ لڑکی نہیں بھولی تھی جس کی شخصیت اس کے ماں کے بدصورت رویے نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ جس نے اس کی خود اعتمادی چھین لی تھی۔ رشتوں پر سے اعتبار ختم کردیا تھا۔

ہنیہ کا ہاسٹل چلے جانا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

سورج کی افق پر پھیلتی لالی اس کے طلوع ہونے کا اعلان کر رہی تھی جس وقت حذیفہ نے فارم پر دستخط کر کے سوئی ہوئی عرشی کے پاس رکھا۔

اس کے بعد عرشی نے ہفتوں کا کام دنوں میں نپٹایا۔ زندگی میں پہلی بار عرشی نے ہنیہ کے کسی کام میں جی جان سے حصہ لیا اور وہ تھا ہنیہ کے جانے کی تیاری۔

وہ جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے جاتے وقت اتنا واویلا مچایا کہ عرشی کے کان بجنے لگے۔ حذیفہ وہاں نہیں تھا۔ وہ صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ وہ ہنیہ کو جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ وہ اندر بیٹھ کر بھی چلاتی رہی۔ حذیفہ کو آوازیں دیتی رہی۔

گاڑی گئی تو اس کے ساتھ ہنیہ کا کمرا کیا بنگلہ بھی رخصت ہوا۔ عرشی نے سکون کا سانس لیا۔

اپنے گھر پر اب اس کا مکمل راج تھا۔ اس راج کا ایک ایک پل وہ پوری طرح سے انجوائے کرنے کے موڈ میں تھی۔

حذیفہ سارا دن گھر سے غائب رہا۔ رات کو آیا تو آتش دان کے سامنے رکھی اپنی مخصوص کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

ابھی سردیوں کا موسم نہیں تھا اس لیے آتش دان ٹھنڈا پڑا تھا۔ پھر بھی حذیفہ اس میں رکھی سوکھی لکڑیوں کے نیچے بجھی ہوئی پرانی راکھ پر نظریں جمائے روشنی اور حرارت کا پتا دیتی کسی چنگاری کے اچانک بھڑک اٹھنے کا جیسے انتظار کر رہا تھا۔ عرشی اپنا کافی سے بھرا مگ لے کر اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

"کتنا عرصہ ہو گیا تھا ہم دونوں کو اس طرح سکون سے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔ اچھا لگ رہا ہے نا؟" عرشی نے مسکرا کر حذیفہ سے تائید چاہی۔

عرشی واقعی اتنی بے حس تھی یا پھر انتہائی بے وقوف۔ جو اس وقت حذیفہ سے ایسی بات کر رہی تھی۔ جواب میں حذیفہ نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا

کہ عرشی کے ہاتھ سے کافی چھلک کر اس کے کپڑوں کو داغ دار کر گئی۔

☼ ☼ ☼

اگر عرشی کا خیال تھا کہ ہنیہ کے جانے کے بعد اسے حذیفہ کی پوری توجہ حاصل ہو جائے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ حذیفہ کے ساتھ جو تھوڑا بہت وقت اسے پہلے مل جایا کرتا تھا وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب وہ صبح گھر سے نکلتا تو رات گئے ہی گھر لوٹتا تھا۔

اگر کبھی اتفاق سے وہ گھر پر موجود بھی ہوتا تو کوئی نہ کوئی کتاب لے کر آتش دان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا یا پھر ٹی وی پر کوئی اسپورٹس "کرنٹ افیئرز" یا پھر نیوز کا کوئی چینل لگا کر دیکھتا رہتا۔ اس نے بہت سالوں کے بعد دوبارہ ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک زمانے میں کلب لیول پر ٹورنامنٹس میں بھی حصہ لیتا اور اکثر جیت بھی جاتا تھا۔ تب عرشی بہت شوق سے اس کے میچ دیکھنے جایا کرتی تھی اور تماشائیوں کی صف میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح اس کے لیے تالیاں بجایا کرتی تھی۔

"تمہیں کم از کم نیشنل لیول پر ضرور کھیلنا چاہیے۔ بہت اچھا کھیلتے ہو؟" عرشی اسے اکساتی۔

"اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتا۔

"تمہیں محنت کی کیا ضرورت ہے۔ تم میں نیچرل ٹیلنٹ ہے۔" عرشی اس سے کہتی۔ "اور اگر ضرورت ہے ــــ تو کر لو نا تھوڑی سی محنت۔ تمہیں کیا اچھا نہیں لگے گا۔ اگر اس کھیل میں تمہارا نام ہو جائے گا۔"

"میں نام کے لیے تو نہیں کھیلتا۔ میں اس لیے کھیلتا ہوں کیونکہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ اگر میں صرف جیتنے کے لیے کھیلوں تو شاید اسے اتنا انجوائے نہ کر سکوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" عرشی منہ بنا کر کہتی۔ "جیتنے کا ہی تو مزا ہے۔ دنیا میں جیت سے زیادہ کچھ اہم نہیں ہوتا۔" عرشی سر اٹھا کر رعونت سے کہتی۔

"نہیں عرشی! جیت سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے اچھا، فیئر اور جان دار کھیل پیش کرنا۔ جس کھیل میں یہ نہ ہو وہ کھیل نہیں جوا ہوتا ہے اور اس کی ہار جیت بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔" حذیفہ عرشی کو سمجھایا کرتا تھا۔

عرصہ ہوا عرشی نے حذیفہ کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا اور حذیفہ اب انجوائے منٹ کے لیے بھی نہیں کھیلتا تھا۔ اب نہ جانے کون سی ذہنی تھکاوٹ تھی اسے، جس سے جان چھڑانے کے لیے وہ خود کو جسمانی طور پر چور چور کرنے لگ پڑا تھا۔ عرشی کو حذیفہ کی ان خود ساختہ مصروفیات اور لاتعلق رویے سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ وہ خود گھر میں کم ٹکتی تھی۔ اس نے رعنا کے ساتھ ان کی سرگرمیوں میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی جو ان ہی کی طرح اپر کلاس خواتین نے مشغلے کے طور پر اپنائی ہوئی تھیں۔ بعض اوقات عرشی کو گھر لوٹنے میں حذیفہ سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی تھی۔

عرشی کو اس ساری روٹین میں اگر کوئی بات ناقابل برداشت لگتی تو وہ یہ تھی کہ حذیفہ، جو نا کسی جذبے یا احساس کے ایک روبوٹ کی طرح اپنے شب و روز بسر کر رہا ہوتا تھا، ہنیہ کے چھٹیوں میں گھر آنے پر یک دم پھر سے زندہ ہو جاتا۔ عرشی سے اس کا چھٹیوں میں گھر آنا بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ایک معصوم لڑکی سے نہ جانے کیسا بیر ــــ تھا کہ وہ اسے کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ محبت کے کسی بھی جذبے یا احساس سے عاری ممتا کے جذبے سے بھی محروم تھی۔ حذیفہ پر مکمل کنٹرول کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

"ممی! خدا کا واسطہ ہے اس عذاب سے میری جان چھڑا لیجئے۔" عرشی ایک بار پھر ــــ رعنا کے سر پر سوار ہو گئی۔

"کس عذاب کی بات کر رہی ہو تم؟" رعنا جو رنگ برنگی دوائیاں ہتھیلی پہ رکھ کر انہیں نگلنے کی تیاری کر رہی تھیں اس کی بات پر حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔

"ہنیہ کی بات کر رہی ہوں میں۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کون سے عذاب میری زندگی میں نظر آ رہے ہیں۔" عرشی نے تنک کر کہا۔

"عرشی پلیز! پھر سے یہ قصہ مت شروع کرنا۔" رعنا نے بے زاری سے کہہ کر گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کے ساتھ اپنے اندر اتاریں۔

پچھلے کئی دنوں سے ان کی طبیعت بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ ہمت جیسے جواب دیتی جا رہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے ہمیشہ چست اور بھاگ دوڑ سے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ ڈاکٹر کوئی خاص بیماری تشخیص نہیں کر سکے پھر بھی آرام کا مشورہ دیا۔

"آپ نے اپنی لائف کو بیسیوں کاموں میں الجھا رکھا ہے میڈم! یہ اس کا نتیجہ ہے۔" یہ ان کے فیملی فزیشن کی رائے تھی۔

"لیکن میں تو ہمیشہ سے اسی طرح کام کرنے کی عادی ہوں۔" رعنا نے کہا تھا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ کچھ عمر کے بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک وقت کے بعد جسم اور دماغ اتنی ٹف روٹین برداشت کرنے کے عادی نہیں رہتے۔ آپ پلیز خود کو تھوڑا آرام دیں۔ ریلیکس کریں۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا۔

مگر عرشی کے ہوتے ہوئے رعنا کو سکون بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ ابھی بھی عرشی کے بگڑے موڈ کو دیکھ کر اور اس کے نتیجے میں کم از کم آدھے گھنٹے تک جاری رہنے والی متوقع بک بک کا سوچ کر ہی رعنا کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

"میں اس قصے کو اس وقت تک چھیڑنا بند نہیں کروں گی جب تک آپ اپنی اس پیدا کی ہوئی مصیبت کا کوئی پکا حل تلاش کر کے نہیں دیتیں۔" عرشی نے کہا۔

"میری پیدا کی ہوئی مصیبت؟ میں نے کیا کیا ہے؟" رعنا نے اچنبھے سے کہا۔

"سارا کیا دھرا آپ ہی کا تو ہے۔ آپ ہی نے یہ ہنیہ نام کی بلا لا کر میرے گلے میں ڈالی تھی۔" عرشی برہمی سے بولی۔ "اسے میری زندگی میں آپ لے کر آئی تھیں اب اسے میری زندگی سے خارج کرنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔"

"بھجوا تو دیا اسے ہاسٹل۔ ہو تو گئی وہ تمہاری زندگی سے خارج۔ اب اور کیا چاہتی ہو تم؟" رعنا نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ سارا ڈراما ان کی توقع سے زیادہ ان کے اعصاب سے طاقت نچوڑ رہا تھا۔

"خاک خارج ہوئی ہے وہ۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد پھر گھر میں موجود ہوتی ہے۔"

"چند دنوں کے لیے ہی تو آتی ہے وہ۔ آنے دو۔ کون سا اب وہ مستقل تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔" رعنا نے سمجھایا۔

"آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ یہی چند دن میری زندگی کے بدترین دن ہوتے ہیں۔"

عرشی اپنی نیل پالش سے سجی مخروطی انگلیوں کو بے دردی سے موڑ رہی تھی جو اس کے اندرونی اضطراب کی نشانی تھی۔

"حذیفہ کے پاس میرے ساتھ بتانے کے لیے ایک پل بھی نہیں ہوتا اس کے آنے پر اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے مکمل طور پر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ آگ لگتی ہے میرے دل میں یہ دیکھ کر۔" عرشی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کمرے کے وسط میں چکر کاٹ رہی تھی۔

رعنا بستر پر اپنا سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"بیٹا! حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔ ہر چیز مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن مجھے ہر چیز اپنی مرضی کے مطابق چاہیے اور ہنیہ کا وجود اسے کبھی پرفیکٹ نہیں ہونے دے گا۔ پلیز ممی کچھ تو کیجئے۔"

"جو کچھ میرے بس میں تھا میں کر چکی ہوں۔ اب اور کیا کروں۔" رعنا بے بسی سے کہنے لگیں۔

"ٹھیک ہے۔ کچھ مت کیجئے آپ۔" عرشی اور بھی طیش میں آ گئی۔

"پتا نہیں کیوں میں اپنی پرابلم لے کر آپ کے پاس آ جاتی ہوں۔ آپ نے کبھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔" عرشی نے سارے لحاظ طاق پر رکھتے ہوئے

انتہائی بدتمیزی کے ساتھ کہا۔
رعنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"کیا کیا تم نے؟ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا؟" رعنا ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ کر عرشی کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔
"میں نے ہمیشہ جو کچھ بھی کیا صرف اور صرف تمہارے لیے کیا۔ مجھے حذیفہ چاہیے میں حذیفہ کے بغیر مر جاؤں گی۔ کون تڑپ تڑپ کر کہا کرتا تھا یہ۔" رعنا نے کڑے تیوروں کے ساتھ عرشی کو اس کی برسوں پرانی کیفیت یاد دلائی۔
"اس وقت میں نے ہاں عرشی! میں نے حذیفہ کو لاکر تمہارے ہاتھ میں تھمایا۔ صرف میری وجہ سے وہ آج اس لڑکی کے ساتھ ہونے کے بجائے تمہارے ساتھ ہے۔ صرف میری وجہ سے۔"
رعنا نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ جتنا تاؤ انہیں آج عرشی کی بات سن کر آیا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ رعنا نے عرشی کے چہرے کے آگے اپنا ہاتھ سوالیہ انداز میں لہرایا۔
"یہ سوچو تم نے اتنے عرصے میں کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پچھلے سات سال سے وہ تمہارا شوہر ہے۔ سات سال کم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے۔ تم سے تو آج تک یہ بھی نہیں ہو سکا۔"
"ممی!" عرشی تلملا کر رہ گئی۔
"چپ کرو اور خبردار جو اب میرے پاس کوئی شکایت لے کر آئیں قصور سراسر تمہارا اپنا ہی ہے۔" رعنا نے عرشی کو آئینہ دکھایا۔
"ممی! میں یہ سب سننے کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔" عرشی غصے سے کلپ رہی تھی۔ یہ سچ اس کی برداشت سے باہر تھا۔
"نہیں سننا چاہتیں تو چلی جاؤ یہاں سے۔ بس بہت کرلی تمہاری مدد اور صلہ بھی دیکھ لیا۔ اب میری توبہ جو میں تمہارے کسی معاملے میں دخل اندازی کروں۔ جاؤ عرشی! اپنے مسئلوں کا حل خود تلاش کرنے کی عادت ڈالو۔" رعنا نے رکھائی سے کہا۔ کچھ دیر عرشی بے یقینی کی کیفیت میں رعنا کی شکل دیکھتی رہی جو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس پلنگ کے اوپر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔
"ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھ سے اتنی ہی تنگ آچکی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں اور آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔" عرشی کا خیال تھا کہ اس جذباتی بلیک میلنگ کے نتیجے میں رعنا اسے روک لیں گی پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رعنا اپنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھی رہیں۔
عرشی جھنجلا کر مڑی اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ واپسی پر عرشی کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ نہایت رف انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔
"میری ہی مت ماری گئی تھی جو حذیفہ جیسے پتھر کے ساتھ سر پھوڑا۔" عرشی نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے سوچا۔
اسے یاد آیا کہ یونیورسٹی کے زمانے میں کتنے لڑکے اس کی ایک نظر کرم کے انتظار میں اس کے ارد گرد منڈلایا کرتے تھے۔ عرشی نے ان میں سے کسی کو بھی توجہ کے قابل نہ سمجھا کیونکہ تب اس کے حواسوں پر حذیفہ سوار تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرلیا ہوتا تو زندگی اتنی پیچیدگیوں میں نہ الجھی ہوتی ہوتی۔
لیکن وہ ان میں سے کس کا انتخاب کیسے کرسکتی تھی؟ وہ کتنے ہی بہترین کیوں نہ ہوں ان میں سے کوئی بھی حذیفہ نہیں تھا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص حذیفہ نہیں ہو سکتا تھا۔
وہ منفرد تھا۔ سب سے الگ۔ اور صرف عرشی کا تھا۔
کیا فرق پڑتا تھا کہ حذیفہ عرشی کو ہر بات میں اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اپنی تمام کج ادائیوں کے باوجود اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا تھا۔
اسٹیئرنگ پر عرشی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایکسیلیٹر پر سے پاؤں کا زور بھی خود بخود کم ہو گیا۔ گھر

میں داخل ہوتے تک گاڑی کی رفتار اور عرشی کا موڈ دونوں چیزیں نارمل حدود کے اندر آچکی تھیں۔
ماربل کے ٹائیلوں سے سجے چمکدار پورچ کی حدیں جہاں ختم ہوتی تھیں وہیں سے گھر کے سامنے بنے ہرے بھرے لان کی شروعات ہوتی تھی۔
اس وقت لان کے عین درمیان گھاس کے اوپر ایک بڑے سائز کا ان فلیٹ ایبل بچھا ہوا تھا جس کے اندر گھر کے دو ملازم پائپ کی مدد سے پانی بھر رہے تھے۔
"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے عرشی نے پانی بھرتے ایک ملازم سے استفسار کیا۔
"صاحب نے اسے بھرنے کو کہا تھا۔ چھوٹی بی بی کو پول میں نہلانا ہے۔" ملازم نے عرشی کو بتایا۔
"کون چھوٹی بی بی؟" عرشی نے الجھ کر پوچھا۔ پھر اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ ہنیہ کی بات کر رہا ہے۔ رعنا کے گھر سے اپنے گھر آنے کے دوران عرشی یہ بھول گئی تھی کہ ہنیہ کی گرمیوں کی چھٹیاں کل سے شروع ہو چکی ہیں اب وہ اگلے دو ہفتے اسی گھر میں عرشی کے سر پر ناچتے ہوئے گزارے گی۔
عرشی نے اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی پر گرتے ہوئے رعنا کے ہی انداز میں سر کو تھام لیا۔
عرشی جس کرسی پر بیٹھی تھی اس کے برابر والی کھڑکی نے آدھی سے زیادہ دیوار کو گھیرا ہوا تھا اور اس کھڑکی میں سے لان کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ حصہ عرشی کے بیڈروم سے دکھتا تھا اس لیے اس کی آرائش و زیبائش پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے تھے۔
لال پتھروں کی بنی روش اس کے درمیان سبزے کا مخملیں فرش اور اس پر سجے نایاب اور قیمتی پودے جو جانے کہاں کہاں سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ شہر کے بہترین لینڈ اسکیپ آرٹسٹ کے تخیل کو بھاری قیمت دے کر اس حسین منظر میں ڈھالا گیا تھا۔
پر اس وقت یہ دلکش و دلنشین نظارہ عرشی کے تنے اعصاب کو پرسکون کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ رنگ و خوشبو سے بھرا یہ خوبصورت منظر عرشی کے لیے نہ صرف اپنی کشش کھو چکا تھا بلکہ کچھ عرصے سے اس کی نظروں میں چبھنے لگا تھا۔ اس چبھن کا آغاز اس دن بلکہ اس رات سے ہوا تھا جس رات ان کی لیڈیز کلب کی سیکریٹری مسز رابعہ نعمان نے اپنے گھر پر پول سائیڈ پارٹی ارینج کی تھی۔ پارٹی کا مقصد گیٹ ٹو گیدر سے زیادہ اپنے نئے سوئمنگ پول کی نمائش کرنا تھا۔ رات کے وقت پول کے اطراف لگی ڈھیروں لائٹوں کے پانی کی سطح پر جھلملاتے عکس نے نہایت فسوں خیز ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ عرشی سمیت وہاں موجود کئی خواتین کے دل میں اس سے بھی کچھ بہتر کر دکھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔
"صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر کمیونٹی کلب کا سوئمنگ پول ہے پھر گھر کے اندر سوئمنگ پول بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔" حذیفہ نے عرشی کی تجویز کو سنتے ہی رد کر دیا تھا۔
"مگر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" عرشی کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ جب وہ لوگ افورڈ بھی کر سکتے ہیں اور ان کے پاس وافر جگہ بھی موجود ہے تب بھی حذیفہ پول بنوانے میں حجت کیوں کر رہا ہے۔
"حرج ہے عرشی! چھوٹے بچوں والے گھر میں سوئمنگ پول بنوانا مناسب نہیں ہوگا۔" حذیفہ نے اپنا اعتراض بیان کیا تو عرشی کا منہ کھلا رہ گیا۔
"کیا؟" اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔
"دیکھو عرشی! ہنیہ ابھی چھوٹی ہے۔ اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا لیکن شوق اتنا ہے کہ جب میں اسے کلب لے کر جاتا ہوں تو فوراً پانی میں چھلانگ لگانے کے لیے دوڑ پڑتی ہے گھر میں پول ہوگا تو یہاں بھی یہی کرے گی۔ کلب میں تو جتنی دیر پانی میں رہتی ہے۔ میں اس کی نگرانی کرتا ہوں گھر میں چوبیس گھنٹے میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" حذیفہ نے کہا۔
"تم خواہ مخواہ فکر کر رہے ہو وہ رشیدہ ہر وقت اس

کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

"جب ہم ماں باپ ہو کر ہر وقت ہنیہ پر نظر نہیں رکھ سکتے تو نوکروں سے یہ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ غفلت نہیں برتیں گے۔"

حذیفہ راضی نہ ہوا۔ ہنیہ کے معاملے میں وہ مڈل کلاس ماؤں سے بھی زیادہ وہمی تھا۔

"مگر مجھے ہر حال میں سوئمنگ پول بنوانا ہے۔" عرشی نے پیر پٹخ کر کہا۔

"کچھ سال بعد دیکھیں گے۔ تب تک ہنیہ بھی سمجھ دار ہو چکی ہوگی۔" حذیفہ نے اسے ٹال کر وقتی طور پر جان چھڑائی۔ آج اپنے سرسبز و شاداب لان کے بیچ ہنیہ کے لیے مصنوعی سوئمنگ پول میں پانی بھرتا دیکھ کر عرشی کو اپنا نہ بن سکنے والا سوئمنگ پول پھر سے یاد آگیا۔

"ہنیہ کے لیے پول لگوانے کی فرمائش فوراً" پوری کردی۔ میرا پول تعمیر کرواتے وقت تکلیف ہو رہی تھی۔" عرشی نے دانت پیس کر سوچا۔ حالانکہ تھوڑی دیر کے لیے سیٹ کیے گئے دو فٹ گہرے بچگانہ سوئمنگ پول میں اور "ایک دس پندرہ فٹ کی گہرائی والے سوئمنگ پول میں کتنا فرق ہوتا ہے' یہ عرشی کو بھی معلوم تھا۔ مگر وہ اکثر ایسے ہی بے جوڑ اور بے تکے موازنے کرکے اپنا پارہ ہائی کرلیا کرتی تھی۔

حذیفہ ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ یہ پول سیٹ کرنے کی ہدایت اس نے یقیناً "فون پر دی ہوگی۔ عرشی کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک وہ خود بھی گھر پہنچ جائے گا۔ جب ہنیہ گھر پر ہوتی تو کوئی میٹنگ' حذیفہ کے قدم دفتر میں زیادہ دیر تک نہیں روک پاتی۔ عرشی کا اندازہ درست تھا۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ کی گاڑی بھی پورچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔

احتجاج کے طور پر عرشی اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی اور جب باہر آئی تب تک رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ حذیفہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ہنیہ کو برگر کھلانے لے جاچکا تھا۔

شروع میں حذیفہ' عرشی کو بھی اپنے اور ہنیہ کے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر عرشی نے کبھی ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کیا تھا۔ اب تو عرصے سے حذیفہ نے اسے ساتھ چلنے کی دعوت دینا بھی چھوڑ دی تھی۔

ناراضی کے اظہار کے طور پر عرشی رات کو بھی ان دونوں کے واپس آنے سے پہلے ہی سوگئی۔

حذیفہ' ہنیہ کو لے کر کب لوٹا۔ کمرے کے اندر کب آیا' "کیا ابھی باہر ہیں یا ہنیہ کے کمرے میں صوفہ کم بیڈ کھول کر اسی پر سوگیا۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر یہ دیکھنے تک کی بھی زحمت نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

ابھی موسم سرما کا پوری طرح آغاز نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی لندن میں اچھی خاصی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو چکی تھیں۔ یہاں کا موسم عجیب تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں بھی جس روز سورج جلوہ افروز نہ ہو اس دن بھی اچھی خاصی ٹھنڈ ہوجاتی تھی۔ سوئٹروں' اوور کوٹ اور اکثر چھتریوں کے بنا گھر سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لندن کا شہر بھی اپنے موسم کی طرح عجیب تھا۔ گیلا' میلا' سلیٹی رنگ کا' سوائے سینٹرل لندن کے جہاں ٹورسٹ لوگوں کی بھرمار ہوتی تھی' سارے شہر کا ماحول اداسی اور یاسیت سے بھرپور تھا۔ پر حیرت کی بات یہ تھی کہ دھوپ نکل آنے پر یہی شہر اپنی کینچلی بدل لیتا تھا۔ اداسی کا چولا اتار کر ایکدم سے چمکنے لگتا۔ بدرنگ عمارتیں خوبصورت لگتیں۔ اندھیری گلیاں روشن ہوجاتیں۔ فقط ایک سورج کے نکلنے یا چھپ جانے سے کسی اور جگہ میں اتنی تیزی کے ساتھ اس قدر حیرت انگیز تبدیلی نہیں آتی تھی جتنی کہ لندن شہر میں۔

موسم گرما رخصت ہو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے چلتے کئی لوگ تیز ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کوٹ کے کالر اوپر کیے تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔

ان ہی سبک خرام لوگوں کے درمیان ایک لڑکی بھی چل رہی تھی جس کی رفتار باقی سب کی نسبت کم تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے سڑک کے کونے پر بنی کافی شاپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اس نے کاؤنٹر سے کافی لی اور ایک کونے میں رکھی بہت ساری بوتلوں میں سے اپنی پسند کا چاکلیٹ پاؤڈر کافی کے اوپر چھڑکا اور پھر شیشے کی دیوار کے ساتھ رکھی میز کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گئی۔ جہاں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ گرم گرم کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ باہر سے گزرنے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

اسے خبر نہیں تھی کہ باہر سے گزرنے والے کئی لوگ بھی کافی شاپ کے اندر بیٹھی اداس آنکھوں والی اس لڑکی کی طرف اکثر متوجہ ہوجایا کرتے تھے۔

وہ لڑکی ہمیشہ شیشے کی دیوار کے سامنے رکھی کرسی پر اکیلی بیٹھا کرتی تھی۔

کافی ختم کرکے لڑکی نے ٹیبل پر رکھا اپنا بیگ اٹھایا اور اسے کندھے پر ڈال کر شاپ سے باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا اس کے گرم ہوتے رخساروں سے ٹکرائی۔ کبھی یہ ٹھنڈ کا موسم اسے بے حد پسند ہوا کرتا تھا۔ تب اسے نہیں پتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس کی زندگی پر ہی برف جم جائے گی۔

ٹھنڈے جذبات' ٹھنڈے احساسات' ہر چیز منجمد' حرارت کے بغیر۔

لڑکی نے بھی اوروں کی طرح کوٹ کے کالر ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے اوپر کیے اور آگے چل پڑی۔ اس کا رخ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف تھا جہاں سے اسے اپنے گھر کی سمت جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔

ٹرین اس کے مطلوبہ اسٹیشن پر پہنچی تو لڑکی برقی سیڑھیوں سے چڑھتی ہوئی زیر زمین اسٹیشن سے نکل کر ایک بار پھر کھلی فضا میں آگئی۔

اب کی بار وہ پہلے کی نسبت تیز قدموں سے ایک سمت میں چلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ایسے رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی جہاں بہت سارے ایک جیسے گھر قطار میں بنے ہوئے تھے۔

ایک گلی میں الٹے ہاتھ کے تیسرے نمبر والے گھر کے سامنے ٹھہر کر اس نے بیگ سے چابی نکال کر دروازے میں لگائی اور گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

گھر کے اندر کچن کی سمت سے کھٹر پٹر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کون؟" دروازہ کھلنے کی آواز سن کر کسی نے کچن میں سے ہی صدا لگائی۔

"میں ہوں۔ جوریہ۔" لڑکی نے اپنا کوٹ دروازے کے ساتھ لگے کوٹ ریک پر ٹانگتے ہوئے جواب دیا۔

"سر! آپ روز یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں جبکہ آپ کو پتا ہے کہ میرے علاوہ اور کسی کے پاس گھر کی چابی نہیں ہے اور میرے علاوہ کوئی دروازہ کھول کر اندر نہیں آسکتا۔" جوریہ نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے پروفیسر صاحب سے کہا۔

"عادت پڑ گئی ہے۔ اب اس عمر میں پرانی عادتیں آسانی سے جان نہیں چھوڑتیں۔" پروفیسر صاحب اس کی طرف پلٹتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

وہ کچن سلیب کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے بنائے سینڈوچز کے کنارے چھری سے کاٹ رہے تھے۔ سلیب کے نیچے فٹ ہوئی کپڑے دھونے کی مشین کے گول شیشے میں سے جھاگ بھرے پانی میں ڈوبے کپڑے گول گول چکر کھاتے نظر آرہے تھے۔

جوریہ کچن کے وسط میں رکھی ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔

یہ ایک مناسب سائز کا کچن تھا۔ انگلینڈ کے متوسط طبقے کے ہر دوسرے گھر میں پائے جانے والے کچن جیسا' سادہ مگر ضرورت کی ہر چیز سے لیس۔

کچن کے وسط میں رکھی جس ٹیبل کے پاس جوریہ بیٹھی تھی اس پر رکھی جیم جیلی کی بوتلیں اور وہ ٹین کے بنے ہوئے سیریلز کے ڈبے یہ بتاتے تھے کہ صبح کا ناشتا عموماً یہیں بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔

اپنے سر پر پہنی اونی ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے

جویریہ کی نظر سیریل کے پیکٹ کے پیچھے سے جھانکتی سگریٹ کی ڈبیہ پر چلی گئی۔

پروفیسر صاحب بھی سینڈوچز سے بھری پلیٹ لے کر جویریہ کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔

"آج کتنے سگریٹ پیے آپ نے؟" جویریہ نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا۔

"ایک بھی نہیں۔" پروفیسر صاحب جلدی سے بولے پھر جویریہ کے ابرو چڑھا کر دیکھنے پر کھسیا کر کہنے لگے۔

"اچھا بابا! ایک پیا تھا۔ اب دن میں ایک سگریٹ کی اجازت تو تم نے بھی دے رکھی ہے۔"

"آپ ایک بار ہمت کرکے مکمل طور پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" جویریہ نے کہا۔

"کملی! اس عمر میں پرانی عادتیں اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔ خاص طور پر اگر وہ بری عادتیں ہوں۔" وہ مسکرائے۔ "اچھا چھوڑو یہ بحث۔ یہ بتاؤ لنچ کیا تھا تم نے؟"

"آج مصروفیت زیادہ تھی۔ وقت ہی نہیں ملا۔" جویریہ نے جواب دیا۔

"اچھا چلو یہ کھاؤ۔ تمہاری پسند کے سینڈوچ بنائے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے پلیٹ جویریہ کے آگے کھسکائی۔

وہ جویریہ کے آنے سے پہلے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتے تھے۔ بہانہ یہ ہوتا تھا کہ انہیں اس وقت بھوک محسوس ہوتی ہے حالانکہ وہ خود یہ سب بس چکھنے کے برابر ہی کھاتے تھے۔

"آپ پلیز روز ایسا مت کیا کریں۔" جویریہ ان کے خلوص کے آگے شرمندہ ہو جاتی۔

"تم بھی پلیز روز دوپہر کا کھانا مت چھوڑا کرو۔" پروفیسر صاحب نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا پھر تحکم بھرے انداز میں کہنے لگے۔

"اچھا اب باتیں کرنا بند کرو اور کھاؤ یہ۔"

جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ میں رکھا ایک تکون اٹھایا اور ہولے ہولے کترنے لگی۔

سینڈوچ واقعی مزیدار تھے۔ جویریہ کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے پہلا کب ختم کرکے دوسرا بھی اٹھا لیا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اپنے دوسرے سینڈوچ کے اختتام پر جویریہ نے نوٹ کیا کہ پروفیسر صاحب نے خود ایک بھی سینڈوچ نہیں لیا تھا۔

"ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولے تو جویریہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

ستر کی دہائی کے اختتام پر ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب ابھی تک انتہائی چاق و چوبند تھے۔ لیکن بہرحال ان کی عمر ایسی نہیں تھی جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔

"آپ کو آرام کرنا چاہیے۔" جویریہ نے احتیاط کے ساتھ کہا۔ پروفیسر صاحب اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"آرام کرکے ہی تھک گیا ہوں۔ اب تھوڑی بھاگ دوڑ کرنا چاہتا ہوں۔"

"لگتا ہے بازغ کی کوئی نئی ای میل آئی ہے۔" جویریہ سمجھ گئی۔ "اس نے پھر اپنا کوئی نیا کارنامہ سنا کر آپ کو انسپائر کر دیا ہوگا۔"

بازغ اب نائیجیریا میں تھا اور اپنے روایتی جوش و خروش کے ساتھ معاشرے سے برائی کے خاتمے کی کوششوں میں مگن تھا۔ اپنی ان کوششوں کے نتائج وہ اکثر بذریعہ ای میل یا فون پروفیسر صاحب کو بھی بتاتا رہتا تھا۔

"بازغ کی میلز تو آتی ہی رہتی ہیں۔ بازغ سے میرا بھلا کیا مقابلہ۔ وہ بلا تکان کام کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ہمت، حوصلہ اور طاقت ہے اور میں۔" پروفیسر صاحب نے گہرا سانس لیا۔ "میری زندگی میں آئے وقفے میری عمر کا تقاضا ہیں۔ ہر تھوڑے عرصے کے بعد اگر رک کر سانس نہیں لوں گا تو اگلا قدم نہیں اٹھا پاؤں گا۔ انسان کو اپنی حدود کا پتا ہونا چاہیے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" جویریہ نے کھوجتی نگاہوں سے

انہیں دیکھا۔ پروفیسر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

"تمہیں وہ لاہور والا وومن سینٹر یاد ہے جہاں تم نے یہاں آنے سے قبل کچھ وقت گزارا تھا؟"

پروفیسر صاحب کی بات سن کر جویریہ کے جسم میں غیر ارادی طور پر ایک دم تناؤ آگیا پر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

"جب میں وہاں کام کیا کرتا تھا تو میں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ اس جگہ کو محض ایک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے یہاں کچھ ایسے ہنر سکھانے کا بھی بندوبست کیا جائے جو غریب عورتوں کی زندگیوں میں بہتری لا سکیں۔ اب چاہے وہ بہتری ان عورتوں کے واپس اپنے خاندانوں میں لوٹ جانے کے بعد اضافی آمدنی کی صورت میں ہو یا پھر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے میں معاون ہو۔ سینٹر کی سربراہ مسز ملک بھی اس معاملے میں میری ہم خیال تھیں لیکن اس وقت ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس تجویز پر عمل کیا جا سکے۔" پروفیسر صاحب نے جویریہ کو بتایا۔

"اور اب وسائل موجود ہیں؟" جویریہ کچھ کچھ سمجھنے لگی۔

"ہاں! کچھ کا بندوبست ہو چکا ہے۔ مزید کی بھی امید ہے۔ سینٹر کو بھی توسیع دی گئی ہے۔ اب وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں وہاں واپس آکر اس کام کو اپنی نگرانی میں پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔" پروفیسر نے کہا۔

"پھر آپ کو ضرور جانا چاہیے۔" جویریہ نے خلوص کے ساتھ کہا۔

"تم چلو گی میرے ساتھ؟" انہوں نے خالی پلیٹیں اکٹھی کرتی جویریہ سے اچانک پوچھا۔

"میں؟" جویریہ نے حیرت سے پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ "میں وہاں کیا کروں گی؟"

"تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ آخر تمہیں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا تجربہ ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔

"نہیں! میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔" پلیٹیں ہاتھ میں لیے ہوئے سر جھکا کر کھڑی جویریہ نے آہستہ سے انکار کیا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" پروفیسر صاحب نے اصرار نہیں کیا۔ جویریہ نے استعمال شدہ پلیٹیں سنک کے اندر رکھیں۔

"ہاں یاد آیا' تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی جاثم کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ تم گھر پہنچی ہو یا نہیں۔ تمہارے سیل فون پر بھی کال کرتا رہا مگر تم نے اٹھایا ہی نہیں۔" پروفیسر صاحب نے جویریہ کو اس کے ایک کولیگ کے فون کے بارے میں بتایا۔

"میرے فون کی بیٹری ختم ہو چکی ہے اس لیے اس کا فون میرے نمبر پر نہیں مل رہا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی اسے کال کرکے تسلی دے دیتی ہوں کہ میں بخیر و عافیت گھر پہنچ چکی ہوں۔ انتہائی وہمی انسان ہے یہ جاثم بھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہو جاتا ہے۔"

جویریہ نے جھوٹی پلیٹوں پر صابن لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہر کسی کے لیے فکر مند نہیں ہوتا ہے وہ۔" پروفیسر صاحب بولے جویریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پروفیسر صاحب کی طرف پشت کیے برتن دھوتی رہی۔

"جاثم اچھا لڑکا ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر صاحب نے بظاہر عام سے لہجے میں جویریہ سے کہا۔

"ہاں بہت اچھا ہے وہ۔ ہمارے پورے پراجیکٹ کو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔"

جویریہ نے پروفیسر صاحب کی طرف مڑتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ جویریہ جان بوجھ کر ان کی بات کا دوسرا مطلب نکال رہی تھی۔ پچھلے سات سالوں کے دوران وہ جویریہ کی عادات سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب مزید کچھ کہتے' کپڑے دھونے کی مشین نے زور سے گھنٹی بجا کر کپڑے دھل جانے کا اعلان کیا۔

"آپ رہنے دیجیے۔ میں باہر ڈال آتی ہوں۔"
جویریہ نے پروفیسر صاحب کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے کچن کی گول شیشے کی کھڑکی کھول کر دھلے کپڑوں کا ڈھیر پلاسٹک کی ٹوکری میں نکالا اور جلدی سے نئے موضوع گفتگو کو چھوڑ کر باہر نکل آئی جہاں گھر کے پچھواڑے میں چھوٹی سی جگہ تھی۔

باہر دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ کونے میں ایک قدیم درخت اگا تھا جس میں موسم کے ساتھ کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے لگا کرتے تھے۔ اس درخت کی مہین ٹہنیاں چلنے والی ہوا کے ساتھ ہلکے ہلکے لہرا رہی تھیں۔ درخت سے کچھ فاصلے پر ہی کپڑے لٹکانے والے تار بندھے ہوئے تھے جویریہ نے ٹوکری میں سے ایک شرٹ نکال کر جھاڑ کر تار پر ڈالی۔
سات سال گزر جانے کے باوجود وہ ماضی کی ایک بھی یاد کو ذہن سے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور پروفیسر صاحب اس سے پوچھ رہے تھے کہ اسے وومن سینٹر میں گزارا وقت یاد ہے؟
بظاہر یہ جویریہ اس جویریہ سے بہت مختلف تھی جسے پروفیسر صاحب بکھری ہوئی ٹوٹی ہوئی حالت میں سات سال پہلے یہاں لے کر آئے تھے۔ تب کسے پتا تھا کہ لز کے پروگرام کے تحت ایڈمیشن حاصل کرنے والی ڈری سہمی اقصیٰ عاری کی قسمت میں ایک دن انگلستان کی ایک اچھی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونا لکھا ہے۔
کہاں بزنس اسٹڈیز اور کہاں سوشل ورک کی ڈگری۔ انسان کہاں سے سفر شروع کرتا ہے' کہاں جانے کا سوچتا ہے اور کہاں جا پہنچتا ہے۔ یہ اسے وقت سے پہلے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس ڈری سہمی جویریہ سے اس پر اعتماد جویریہ تک کا سفر کتنا کٹھن تھا' یہ صرف جویریہ ہی جانتی تھی۔
لیکن یہ سارا فرق صرف ظاہری حد تک تھا۔ پروفیسر صاحب کو معلوم تھا کہ اندر سے جویریہ اب بھی اتنی ہی معصوم' حساس اور بھولی بھالی ہے' جتنی پہلے ہوا کرتی تھی اور انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اپنے کام میں مگن کھاتی پیتی ہنستی بولتی بظاہر ہر طرح سے ایک نارمل زندگی گزارتی جویریہ نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کرلیے تھے اور اب انہیں کسی کے لیے بھی دوبارہ کھولنے پر تیار نہیں تھی۔
جویریہ سے کہیں بہتر تو اس کی پشت پر اگا ٹنڈ منڈ شاخوں والا درخت ہی تھا جو اپنے پرانے کمزور پتے جھاڑ کر آنے والے خوشگوار دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ جب ساڑھے سات بجے صبا کے گھر پہنچی تو گھر میں کسی قسم کی دعوت کے کوئی آثار نظر آرہے تھے حالانکہ صبا نے اصرار کرکے جویریہ کو ویک اینڈ پر اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔
"آج ڈنر ہے بھی یا تم نے مجھے بلانے کے لیے بہانہ گھڑا تھا؟" جویریہ کو صبا کا آؤٹ بنا ٹنگ سا حلیہ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔
"ہاں ہاں ہے کیوں نہیں۔" صبا سیڑھیوں پر سے چھلانگ مار کر اترتے ہوئے بولی۔ "تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔ تب تک جاثم بھی پہنچ جائے گا۔"
"جاثم بھی آرہا ہے؟" اوور کوٹ کے بٹن کھولتی جویریہ کے ہاتھ رک گئے۔ "اور کس کس کو بلایا ہے تم نے؟"
"کسی کو بھی نہیں۔ بس تم اور جاثم ہی ہو۔ تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ کھانا باہر جا کر کھائیں گے۔" صبا یہ کہتے ہوئے دھپ دھپ کرکے سیڑھیاں چڑھتی اوپر بھاگ گئی۔ جاثم کے گھر سے یہاں تک کا راستہ کم سے کم بھی ڈیڑھ گھنٹے کا ضرور تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ جویریہ کو نہیں معلوم تھا کہ جاثم کی صبا سے اتنی دوستی ہے کہ وہ صرف ایک ڈنر کے لیے یہاں تک کی لمبی ڈرائیو کرکے اپنا ویک اینڈ خراب کرنے کو تیار ہو جائے گا۔

بہرحال اگر صبا نے بلایا تھا اور جاثم آرہا تھا تو جویریہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔
جویریہ اندر سٹنگ روم میں آکر صبا کی امی کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ ٹی وی پر چلنے والا گیم شو دیکھنے لگی۔
صبا کے والدین کا تعلق میرپور سے تھا اور وہ کئی سال پہلے بہتر مستقبل کی تلاش میں انگلستان آئے تھے۔ صبا اس نسل سے تعلق رکھتی تھی جسے "برٹش بورن" کہا جاتا تھا جو اپنے پاکستان' انڈیا یا بنگلہ دیش میں پیدا ہونے والے ماں باپ کے برعکس یہیں انگلستان میں پیدا ہو کر پرورش پائی تھی۔ جن کے والدین نے ساری عمر چھوٹے موٹے کام کرکے انہیں اچھی تعلیم دلوا کر اس قابل بنا دیا ہوتا تھا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ گوروں کے اس دیس میں ان کے شانہ بشانہ چل سکیں اور بہترین ملازمتوں کے لیے ان کے ساتھ برابری کی سطح پر مقابلہ کرسکیں۔
صبا شوخ اور زندہ دل لڑکی تھی جبکہ جویریہ نسبتاً خاموش اور سنجیدہ مزاج رکھتی تھی۔ دونوں کے مزاج میں اتنا فرق ہونے کے باوجود دونوں کی دوستی اب تک قائم تھی اور اسے قائم رکھنے میں جویریہ سے زیادہ صبا کا ہی ہاتھ تھا۔ جویریہ کی نظریں ٹی وی اسکرین سے بھٹک کر سٹنگ روم سے ملحق ڈائننگ روم کی طرف چلی گئیں' جہاں صبا کا بھائی عبیداللہ لکڑی کی میز پر کتابیں پھیلائے اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔
عبیداللہ صبا کا سگا بھائی نہیں تھا۔ وہ ایک افغان لڑکا تھا جس کا تعلق قندھار کے علاقے سے تھا اور جس کے خاندان سمیت پورے گاؤں کو جنگ کی تباہ کاریوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا تھا۔ صرف پندرہ سالہ عبیداللہ ہی کسی طرح اپنی جان پر کھیلتا ہوا انگلستان پہنچ گیا۔ گو کہ عبیداللہ اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے لاتعداد افراد میں سے ایک تھا مگر اسے ایک چیز میں دوسروں پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یہ کہ وہ فقط پندرہ سال کا تھا اور ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا تھا جسے بین الاقوامی سطح پر غیر محفوظ قرار دیا جاچکا تھا۔ اکثر معاملات میں ظالمانہ حد تک بے حسی کی چادر اوڑھ لینے والی یہاں کی حکومت کے چند اصول ایسے بھی تھے جو قابل تحسین تھے اور ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ کسی لاوارث بچے کو' چاہے وہ غیر قانونی طور پر ہی ملک میں کیوں نہ داخل ہوا ہو' کسی ایسے علاقے میں واپس نہیں بھیجا جائے گا' جہاں اس کی جان کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہ دی جاسکے۔ چنانچہ سن بلوغت کو پہنچ جانے تک عبیداللہ کو نہ صرف یہاں رہنے کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے جڑے دیگر اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی حکومت برطانیہ نے اپنے سر لے لی۔
صبا کے والدین عبیداللہ کے رضاعی والدین تھے۔ عبیداللہ پچھلے دو سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا اور اب تک ان کے خاندان کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع' اپنے کام سے کام رکھنے والا ذہین لڑکا تھا جو پسماندہ علاقے سے آنے کے باوجود بہت تیزی کے ساتھ خود کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر رہا تھا۔ اگلے سال عبیداللہ کی اٹھارویں سالگرہ آنے والی تھی۔ قانونی طور پر بالغ ہوجانے کے بعد حکومت اسے یہاں رہنے کی اجازت دے گی یا پھر اسے اس کے ملک واپس بھیج دیا جائے گا' یہ بات فی الحال صبا کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔
ٹی وی پر چلنے والا گیم شو اپنے آخری مراحل میں تھا تب صبا تیار ہو کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔
"یقیناً جاثم ہوگا۔" صبا نے گردن کے گرد مفلر لپیٹتے ہوئے اندازہ لگایا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دروازے پر جاثم پھولوں کا بوکے اور چاکلیٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
"ہیلو! کیسی ہو؟" اس نے اندر آتے ہوئے جویریہ اور صبا دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا۔
جاثم درمیانے قد کا خوش شکل عراقی نوجوان تھا جو صبا اور جویریہ کے ہی دفتر میں ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ صبا اور جویریہ جاثم کی ماتحتی میں کام کرتی

تھیں لیکن یہ جاثم کے خوش اخلاق اور دوستانہ رویے کا کمال تھا جس نے اس کے ساتھی ورکرز کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت خوشگوار رکھے ہوئے تھے۔

جویریہ کا خیال تھا کہ جاثم پھول اور چاکلیٹ صبا کے لیے ڈنر پر بلانے کے شکریے کے طور پر لایا ہے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جاثم نے دونوں چیزیں صبا کو پکڑانے کے بجائے جویریہ کی طرف بڑھائیں۔

"ہیپی برتھ ڈے جویریہ!" جویریہ نے ٹھٹھک کر ساتھ کھڑی صبا کی طرف دیکھا، جس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"سرپرائز۔" صبا چہکی۔

"یہ سب کیا ہے؟" جویریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہ تمہاری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ اصولاً" تو یہ دعوت تمہیں ہم لوگوں کو دینی چاہیے تھی لیکن تم نے نہیں دی اس لیے ہم دے رہے ہیں۔" صبا نے کہا۔

جویریہ نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب چھوٹی تھی تب بھی نہیں۔ ان کے گھر میں سالگرہ وغیرہ منانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ پر اب، اب پروفیسر صاحب، صبا اور جاثم جیسے مخلص ساتھی اسے یہ دن بھولنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کسی نہ کسی اشارے سے یہ باور کرا دیتے کہ سال کے تین سو پینسٹھ عام سے گزرنے والے دنوں میں یہ ایک دن کم از کم جویریہ کے لیے بہت خاص ہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں۔" جویریہ نے کہا۔

"تو تم بچوں کی طرح شکریہ کہو اور چلو ہمارے ساتھ۔ ہم گرین اسٹریٹ جا کر کھانا کھائیں گے۔"

صبا نے گھر کے پاس ایک جگہ کا نام لیا جو پاکستانی کھانوں کے لیے مشہور تھی۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف کے ننھے ننھے سفید گولے ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے گر رہے تھے۔

گرین اسٹریٹ صبا کے گھر کے پاس ہی تھی۔ جاثم کی گاڑی میں سوار ہو کر ان لوگوں کو وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

"چلو جاثم! آج جویریہ کی سالگرہ کے بہانے تم بھی ہمارے ملک کے ذائقوں سے آشنا ہو جاؤ گے۔ اس جگہ پر کم و بیش ہر قسم کا پاکستانی کھانا مل جاتا ہے۔" صبا نے جاثم کو بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں پہلے بھی یہاں کھانا کھانے آچکا ہوں۔"

"سچ؟" صبا نے حیرت سے کہا۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں پاکستانی چیزیں پسند ہیں۔"

"پاکستانی چیزوں میں ناپسند کرنے والی کون سی بات ہے۔" جاثم نے سنجیدگی سے کہا تو جویریہ پورے انہماک کے ساتھ گاڑی کی کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ گزرنے والے سائن بورڈ پڑھنے لگی۔ پتا نہیں اسے یہ بات کیوں ذو معنی لگنے لگی۔ کھانا اچھے خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ جویریہ نے بل دینے کی کوشش کی مگر جاثم اور صبا دونوں نے انکار کر دیا۔

"یہ دعوت ہم دونوں نے دی ہے اس لیے بل بھی ہم ہی دیں گے۔ تم کسی اور دن ہم دونوں کی دعوت کر کے حساب برابر کر لینا۔" صبا نے کہا۔

ان لوگوں کے کھانا کھانے کے دوران برف باری میں کافی تیزی آچکی تھی۔

جویریہ کا خیال تھا کہ صبا کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد جاثم اسے اسٹیشن تک لفٹ دے گا مگر وہ گاڑی اس سے بھی آگے نکال کر لے گیا۔ "یہ کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہیں گھر چھوڑنے۔" جاثم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے اسٹیشن پر اتار دیتے۔ میں خود چلی جاتی۔" جویریہ نے گاڑی کی سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تمہارا گھر میرے راستے میں ہی پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"ایسا بھی کوئی راستے میں نہیں ہے۔ اچھا خاصا آؤٹ آف وے جانا پڑے گا تمہیں۔" جویریہ ناراضی سے بولی۔ جویریہ کی رہائش گرین وچ میں تھی۔ لندن

کے مشہور زمانہ میری ٹائم میوزیم کے پاس جہاں بنی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر زمین میں سے زیرو میریڈین نامی ایک سیدھی لکیر گزاری گئی ہوئی تھی۔ پوری دنیا کو جغرافیائی لحاظ سے خط استوا پر بانٹنے والی تین سو ساٹھ فرضی لکیروں میں یہ پہلی لکیر تھی اور وہیں پر نصب ایک گھڑی کے وقت کو GMT یعنی گرین وچ مین ٹائم کہا جاتا تھا جس سے ساری دنیا اپنے اپنے وقت کا حساب لگاتی تھی۔

"مجھے آؤٹ آف وے نہیں پڑے گا اور اگر راستہ لمبا ہو گا بھی تو میرا ہو گا، تمہیں اس سے کیا۔ تم تو گھر پہنچ جاؤ گی۔" جاثم جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ چپ ہو گئی۔

جاثم سے بحث کرنا لا حاصل تھا۔ جویریہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں برف باری کی وجہ سے ٹریفک آہستہ چل رہی تھی مگر سڑک پر گرنے والی برف کی تہ ابھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ آمد و رفت بند ہو جاتی جیسا کہ عموماً شدید برف باری کے دوران ہو جایا کرتی تھی۔ زیر زمین راستوں پر برف باری عموماً اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ جویریہ تو کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی جاتی مگر جاثم کا واپسی کا راستہ خاصا لمبا تھا اور برف باری تیز ہونے کی صورت میں اس کے راستے میں پھنس جانے کے امکانات کافی زیادہ تھے۔ جویریہ نے آسمان سے گرتے سفید گولوں کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔

"تم کل شام کو فارغ ہو؟" سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتے ہوئے جاثم نے جویریہ سے اچانک پوچھا۔

"کیوں کیا کوئی اور سرپرائز ہے؟"

"ہے تو۔ پر تمہارے لیے نہیں۔" جاثم ونڈ اسکرین پر سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "دراصل مجھے تمہیں کل اپنے گھر لے کر جانا ہے۔"

جاثم کی بات پر جویریہ ایک دم سے محتاط ہو گئی مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔

"کل میرے پیرنٹس کی شادی کی چالیسویں سالگرہ ہے۔ لیڈن برگ سے میرا بڑا بھائی اور سالسبری سے بہن بھی پہنچ رہی ہے۔ ان دونوں نے پہلے فرضی مصروفیات کا بہانہ بنا کر آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس لیے میرے پیرنٹس کو ان کے آنے کے بارے میں نہیں پتا۔ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر انہیں یہ سرپرائز دینے کا پلان بنایا ہے۔"

جاثم جویریہ کو بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کا سا اشتیاق تھا اور مسکراہٹ میں شوخی تھی۔ اس لمحے جویریہ کو وہ چھوٹا سا بچہ لگا جو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر پلان کی ہوئی اپنی شرارت کے بارے میں سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" جویریہ بھی مسکرانے لگی۔ "اور کون کون ہو گا تمہارے پیرنٹس کی اینی ورسری پر؟"

"باہر سے تو کوئی نہیں۔ بس اپنے گھر والے ہی ہوں گے۔" جاثم نے بتایا تو جویریہ سوچ میں پڑ گئی۔

"پھر شاید میرا آنا مناسب نہیں ہو گا۔" جویریہ نے جھجکتے ہوئے عذر پیش کیا۔

"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میرے گھر والے تمہیں اپنے خاندان کا حصہ ہی سمجھتے ہیں۔" جاثم نے برہمی سے کہا۔

جاثم کے گھر والے اسے اپنے خاندان کا حصہ کیوں سمجھنے لگے تھے، یہ جویریہ کو معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وہاں جانے سے کترا رہی تھی۔

"نہیں جاثم! میں نہیں آپاؤں گی۔" جویریہ نے انکار کیا۔

"جویریہ! اما نے مجھے خاص طور پر تمہیں لے کر آنے کو کہا ہے۔ تم نہیں آؤ گی تو انہیں بہت مایوسی ہو گی۔" جاثم نرمی سے بولا۔

جویریہ کو جاثم کی امی اچھی لگتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں جویریہ کو دیکھ کر امید کے جو رنگ ابھرا کرتے تھے وہ جویریہ کو حزن زدہ کر دیتے تھے۔ وہ ان کے گھر جا کر ان کی ایسی توقعات کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتی تھی جن پر وہ پوری نہ اتر سکتی ہو۔ مگر دوسری طرف وہ

اس نرم خو اور محبت کرنے والی عورت کی خواہش کو رد کرکے اس کا دل توڑنے پر بھی خود کو راضی نہیں کر پا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جاؤں گی۔" جویریہ نے بے چارگی سے کہا۔ "مگر مجھے اتنی دور سے لینے کے لیے مت آنا۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"اچھا بابا! جیسے تمہاری مرضی۔" وہ جویریہ کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے گہرا سانس لے کر بولا۔

"کل شام سات بجے۔ دیر مت کرنا۔" اس نے جانے سے پہلے جویریہ کو پھر یاد دہانی کرائی اور پھر اپنی گاڑی سمیت برف کی گرتی چادر میں گم ہو گیا۔

جاشم کا خاندان عراق پر نوے کی دہائی میں امریکی فوج کے ابتدائی حملوں کے دوران نقل مکانی کرکے یہاں آیا تھا۔ جویریہ ایک دو بار پہلے بھی جاشم کے گھر والوں سے مل چکی تھی۔ وہ سلجھے ہوئے مہذب لوگ تھے۔ جاشم کے والد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ بغداد میں ان کا نام تھا' ساکھ تھی جو جنگ کے دوران ان کے آبائی گھر کی طرح ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ ساتھ ہی ان کے بچوں کا وہ تابناک اور روشن مستقبل جسے محفوظ بنانے کے لیے انہوں نے عمر بھر محنت کی تھی' اسی ملبے سے اٹھنے والی گرد و غبار میں کہیں گم ہوتا نظر آیا۔ تب حالات سے مایوس ہو کر وہ اپنے خاندان سمیت یہاں آگئے اور ایک نئے ملک میں اپنی اور اپنے بچوں کی نئی زندگی کی شروعات کی۔

جاشم کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے طب کا ہی پیشہ اپنایا۔ ان میں سے ایک بھائی لندن میں اور ایک بھائی ایڈن برگ کے ایک بڑے اسپتال میں سرجری کے شعبے سے منسلک تھا۔ جاشم کی بڑی بہن بھی ایک آرتھوپیڈک سرجن سے بیاہی ہوئی تھی اور سالسبری کے گرد و نواح میں رہائش پذیر تھی۔

ڈاکٹروں سے بھرے اس خاندان میں اکیلا — جاشم ہی تھا جو سوشل ورک کی طرف آنکلا تھا۔ اب تک اس کی زندگی صرف اپنے کام کے گرد ہی گھومتی رہی تھی۔ گھر والوں کے احساس دلانے کے باوجود اسے اپنے شب و روز میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کی جویریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

جویریہ سے مل کر جاشم کو پہلی بار احساس ہوا کہ اگر اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں کسی کا ساتھ مل جائے تو کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ زندگی مصروف سہی لیکن اس مصروفیت میں اگر تھوڑی سی خوشبو' تھوڑے سے رنگ بھی شامل ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وہ جوان تھا' خوش شکل تھا' خود کفیل اور خود مختار بھی تھا۔ ایسے نوجوان مغرب میں اب ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں رشتہ جوڑنے پر سب راضی تھے مگر رشتوں کو قانونی شکل دینے کا حوصلہ کسی کسی میں ہی رہ گیا تھا۔

جویریہ جاشم کے ساتھ پچھلے دو سال سے کام کر رہی تھی اور ان دو سالوں کے دوران وہ جان چکی تھی کہ جاشم ایک شائستہ اور نفیس انسان ہے۔ جویریہ اسے ایک کولیگ کی حیثیت سے پسند بھی کرتی تھی اور اس کے کام کرنے کے طریقہ کار سے متاثر بھی تھی۔ مگر یہ پسندیدگی صرف کام کی حد تک تھی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جاشم کی دلچسپی صرف جویریہ کے کام تک محدود نہیں تھی' یہ بات سب ہی سمجھ چکے تھے۔ یہاں تک کہ جویریہ خود بھی۔

جاشم ویک اینڈ پر ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کرکے صبا کے لیے نہیں' جویریہ کی خاطر آیا تھا۔ وہ اس کے لیے اس سے زیادہ بھی کر سکتا تھا' یہ بات جویریہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے جویریہ جاشم کے ساتھ کام کے علاوہ زیادہ وقت گزارنے سے گھبراتی تھی۔

مسئلہ جاشم کے ساتھ نہیں تھا۔ مسئلہ جویریہ کے ساتھ تھا' جو جاشم کی طرف سے ملنے والے واضح اشاروں کے باوجود اب تک اسے کوئی مثبت جواب نہیں دے پائی تھی۔

جویریہ کا دل ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہو چکا تھا اور یہ بات وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں جاشم کو جتا بھی چکی تھی۔ جاشم کوئی ٹین ایجر نہیں تھا جو قسمیں کھا کر' رات بھر عشقیہ ایس ایم ایس کرکے جویریہ کو اپنی محبت کا یقین دلاتا۔ بتیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سمجھ چکا تھا کہ ایسے فیصلے زور زبردستی ڈال کر نہیں کرائے جا سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نوخیز محبت کے زخموں کو بھرنے میں سب سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اسے امید تھی کہ جویریہ ایک نہ ایک دن ماضی کے تکلیف دہ شکنجے سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گی اور تب وہ اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو گی۔

☆ ☆ ☆

جویریہ کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک جاشم کے گھر میں ہونے والی دعوت میں الجھا ہوا تھا۔

اس کی توقع کے خلاف جاشم کے گھر اس کا اچھا وقت گزرا تھا۔ جاشم کی امی نے جن کے چہرے پر جھریوں کے ساتھ شفقت اور اپنائیت کی بھی جھلک تھی' اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔

کھانے کے بعد انہوں نے جویریہ کو پرانی البم میں سے جاشم اور اپنے دوسرے بچوں کی تصاویر دکھائیں۔ جاشم کی ماما اور اس کے خوش مزاج و زندہ دل ڈیڈ کے درمیان صوفے پر بیٹھ کر ان پرانی یادگاروں کو دیکھتے ہوئے اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ ان کے گھرانے کا حصہ نہیں ہے۔

چند پرانی تصویریں تھیں جنہیں جویریہ بیٹھ کر دیکھ رہی تھی اور ایک تازہ تصویر تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے بن رہی تھی۔ جاشم کے ماں باپ' بہن بھائی اور ان کے چاروں طرف دوڑتے بھاگتے' کھیلتے کودتے بچے۔ ایک مکمل اور خوش باش خاندان کی تصویر۔

ایسے ہی کسی خاندان کا حصہ بننے کی جویریہ نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ ایسی ہی محبتوں اور چاہتوں کا حصہ دار بننے کی خواہش جو آج تک بھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔

کبھی کبھی تو جویریہ کو عبداللہ جیسے حماں نصیب پر بھی رشک آتا' جس سے قدرت نے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد اسے پھر سے ایک محبت کرنے والا خاندان عطا کر دیا تھا۔

جاشم کے گھرانے کی پرانی تصویروں میں جویریہ شامل نہیں تھی۔ مگر اب تخلیق ہونے والی تصویر کا حصہ وہ بن سکتی تھی۔

یہ اپنائیت اور لگاوٹ سے بھرا خاندان اسے اپنی آغوش میں سمیٹنے کو تیار تھا۔ پھر کیوں وہ اب تک ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ اتنا تو اس کا بھی حق بنتا تھا کہ وہ تھوڑی سی خوشیاں اپنی جھولی میں ڈال لے۔ تھوڑی سی چاہتوں پر اپنا بھی حق جما سکے۔

جویریہ کتنی دیر خالی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ آخر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے سائیڈ پر رکھا فون اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

"آپ کے پراجیکٹ میں میرے لیے ابھی بھی گنجائش ہے؟" جویریہ نے آہستہ آواز میں استفسار کیا۔

"گنجائش کا کیا مطلب؟ تمہاری جگہ کوئی اور لے سکتا ہے کیا؟" دوسری طرف سے پروفیسر صاحب بولے۔

"ٹھیک ہے سر! تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" جویریہ نے کہا۔ "میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہو؟" پروفیسر صاحب ایک دم بولے تو جویریہ بھونچکی رہ گئی۔

"یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ جہاں مخالف کا زور بڑھا یا حالات ناموافق ہوئے وہاں سے فرار اختیار کر لی۔ پر مجھے کیا۔ میرا تو فائدہ ہی ہو رہا ہے نا۔" نہیں جانے کیوں ہنسی آئی تھی۔

"بے چارہ جاشم! ہاہا۔" وہ پھر ہنستے ہی چلے گئے۔

جویریہ نے جھنجلا کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ چکن تڑائی کر کے دیکھو۔ یہاں کی کڑاہی کافی مشہور ہے۔" حذیفہ نے ایک ڈش محب کے آگے سرکاتے ہوئے اس سے کہا۔

"اس کی باری جب آئے گی تو اس کو بھی ٹرائی کر لوں گا۔ تم نے اتنا کچھ منگوا لیا ہے کہ چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جائے گا۔" محب نے جواب دیا۔ ماضی کے دبلے پتلے محب اور آج کے محب میں خاصا فرق آ چکا تھا۔ اس کا جسم پہلے کی نسبت کافی بھاری ہو گیا تھا اور آنکھوں پر سنہری فریم کے چشموں نے جگہ بنا لی تھی۔

"ویسے اب تم سچ مچ کے ڈاکٹر لگنے لگے ہو۔" حذیفہ نے محب کو چھیڑا۔

"اور تمہیں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔ اب تک ویسے کے ویسے ہو۔" محب رشک سے بولا۔

"نہیں خیر۔ فرق تو پڑا ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

تبدیلی تو حذیفہ میں بھی آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ محب کی تبدیلی نظر آتی تھی جبکہ حذیفہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

"بھابھی کیسی ہیں؟" محب نے پلیٹ میں پالک پنیر ڈالتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔"

"اور بیٹی؟ وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے؟"

"ننھی سات سال کی ہو گئی ہے۔" حذیفہ نے مسکرا کر بتایا۔ "اور تمہارے بچے؟"

"ایک ابھی پانچ سال کا ہوا ہے' دوسرا ساڑھے تین سال کا ہے۔ بے حد بدمعاش ہیں دونوں' ہر وقت منہ بگاڑ کر انگریزی بولتے رہتے ہیں۔" محب نے منہ بنا کر حذیفہ کو بتایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"قصور ان کا نہیں' تمہارا ہے۔ تم ہی انہیں وہاں لے کر گئے تھے۔" حذیفہ نے کہا۔ محب اپنی فیملی کے ساتھ کافی عرصہ پہلے کینیڈا شفٹ ہو گیا تھا اب کئی سال کے بعد اس کا پاکستان چکر لگا تھا۔

"ہاں یار! اور اب میں سوچتا ہوں کہ میرا باہر جانے کا فیصلہ صحیح تھا بھی یا نہیں۔ بعض دفعہ ہم اپنا فیوچر بنانے کے چکر میں کچھ ایسی چیزوں کی قربانی دے دیتے ہیں جن کی اہمیت سے ہم اس وقت واقف نہیں ہوتے۔"

"تو واپس لوٹ آؤ۔" حذیفہ نے مشورہ دیا۔

"ہاں ان شاء اللہ۔" محب نے موضوع بدلا۔ "تم بتاؤ تمہاری اس دوست کا کیا حال ہے؟" محب کے ذہن میں اچانک کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہوئی۔

"کون سی دوست؟"

"وہی جس کا کیس تم مجھ سے ایک بار ڈسکس کرنے آئے تھے۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں۔ جویریہ۔ کہاں ہوتی ہے وہ آج کل؟"

"تمہیں وہ اب تک یاد ہے؟" حذیفہ نے حیرت سے کہا۔

"بھولے تو تم بھی نہیں ہو۔" محب حذیفہ کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"معلوم نہیں۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ اب تو کئی سال ہو چکے ہیں۔" حذیفہ نے بتایا۔

"کبھی کہیں سر راہ ملاقات' کوئی اتفاقیہ مڈبھیڑ؟" محب کو تجسس ہو رہا تھا۔ حذیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"دو تین سال پہلے لندن انڈر گراؤنڈ میں ٹرین پر چڑھتی ایک لڑکی پر اس کا گمان ہوا تھا۔ پر وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ وہ بھلا وہاں کہاں؟" حذیفہ محب کے سر کے پیچھے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتا ہوا خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ اب وہ محب کو کیا بتاتا کہ کئی بار جس کو وہ اپنی تلاش کا انت سمجھا' وہاں جانے پر معمولی شباہت کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔

اسماء کے بستر مرگ پر کیے گئے اعتراف کے بعد سے اسے جویریہ کو ڈھونڈنے کی بے چینی لگ گئی تھی۔ رعنا کے بولے اس جھوٹ کا پول بھی اسی لیے کھل گیا تھا جس کا سہارا لے کر انہوں نے حذیفہ کو عرشی سے شادی کے لیے رضامند کیا تھا۔ پر حذیفہ نے یہ بات کبھی رعنا کو جتائی نہیں تھی اگر وہ اپنی ماں کو معاف کر سکتا تھا تو رعنا کو بھی کر سکتا تھا۔ دونوں ماؤں نے اپنی

دانست میں اپنی اپنی اولاد کا مستقبل محفوظ کرنے کی سعی کی تھی۔

محب نے حذیفہ کی طرف دیکھا جس کی توجہ کھانے سے ہٹ چکی تھی۔ وہ دیوار پر لگی تصویر میں اپنی بھولوں کی جھرمٹ میں پائیں باغ کی شہ نشین پر استراحت فرماتی مغلیہ شہزادی کے نقوش میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ پینٹنگ کے دونوں طرف دیوار میں بنے طاقچوں میں سجی ہوئی لمبی گردن والی صراحیاں اور سفید براق چاندنی سے ڈھکے اور سنہری کم خواب کے گاؤ تکیوں سے سجے پست قد تخت جن پر کھانا چنا گیا تھا۔

محب کو اچانک ہی سارا ماحول انتہائی دیدہ زیب اور دلفریب لگنے لگا تھا۔

"تم نے ہاتھ کیوں روک لیا۔ یہ لو نا۔" حذیفہ کا دھیان پھر سے محب کی طرف ہوا۔ اس نے اپنے فرائض میزبانی ادا کرتے ہوئے ایک ڈش محب کے آگے کی اور بیرے کو تازہ اور گرم نان لے کر آنے کا اشارہ کیا۔

کھانے پینے کا سلسلہ بظاہر وہیں سے واپس جڑ گیا جہاں پر تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا' پھر بھی محب اپنے دل سے اس پشیمانی کے احساس کو پوری طرح نہ نکال سکا کہ اس نے نادانستگی میں ایسا قصہ چھیڑ دیا تھا جو شاید اسے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

عرشی نے انگلی کی مدد سے اپنے سن گلاسز کو واپس آنکھوں کے سامنے کیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

برگد کے بڑے سے پیڑ کے سائے میں دھوپ کی تیز شعاعوں سے خود کو بچا کر کھڑی عرشی کے سامنے خالی میدان کے پار ایک زیر تعمیر عمارت تھی جس کے اندر ہر دو تین فٹ کے فاصلے پر فرش سے لے کر چھت تک گڑے کیے لمبے لمبے بانس اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اس عمارت کی پہلی چھت ڈلے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

عرشی کو زیر تعمیر عمارتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس گرمی کے موسم میں طویل چٹیل میدان پار کر کے اسے جا کر دیکھنے کا حوصلہ تھا۔ لیکن یہ عمارت یہاں پر ہونے والے ترقیاتی کاموں میں کا حصہ تھی اور جس کا ہر ایک کو معائنہ کرانا یہاں کے نگران محمود اختر صاحب کا خاص شوق تھا۔

عرشی نے دھول' مٹی اور بجری کے ڈھیر کے درمیان سے گزرتے محمود صاحب کی پشت کو دیکھا جو سر پر برستی آگ سے بے نیاز' ساتھ چلتے حذیفہ کو اس عمارت کے تعمیر ہو جانے کے بعد اسے استعمال میں لائے جانے کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔

حذیفہ عموماً عرشی کے ساتھ کم ہی کہیں آیا جایا کرتا تھا مگر آج عرشی بصد اصرار اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ اسے دکھانا چاہتی تھی کہ اس کی مصروفیات اتنی فالتو اور بے کار بھی نہیں ہیں۔ جتنا وہ تصور کرتا ہے۔

اور اس جگہ کے بارے میں عرشی کو ہمیشہ اچھی ہی رپورٹ ملتی آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ جگہ عرشی کی نہیں بلکہ رعنا کی محنت کا نتیجہ تھی۔ رعنا اپنے اس پراجیکٹ کی تکمیل تک زندہ نہ رہ سکیں ورنہ اس ادارے کی کارکردگی یقیناً ان کا سر فخر سے بلند کر دیتی۔

رعنا اس پر اسرار بیماری سے صحت یاب ہو ہی نہیں پائی تھیں جس کا سراغ ڈاکٹرز ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

رعنا کے ساتھ فلاحی کاموں میں عرشی نے ان کی زندگی میں ہی حصہ لینا شروع کر دیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد ان کاموں سے منسلک تمام ذمہ داریاں جیسے عرشی کو ورثے میں مل گئیں۔

رعنا کے انتقال کے بعد حذیفہ نے عرشی کے ساتھ برتاؤ میں خاصی تبدیلی کی تھی۔ زیادتی وہ پہلے بھی نہیں کرتا تھا اب اس کا رویہ مزید نرم ہو گیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ماں باپ کے گزر جانے کے بعد جس طرح وہ خود اکیلے پن کا شکار ہو گیا تھا عرشی بھی اسی کیفیت سے گزرے۔

حذیفہ یہاں آکر عرشی کی توقع کے مطابق متاثر ہوا یا نہیں لیکن وہ دلچسپی ضرور لے رہا تھا۔ یہ اندازہ عرشی کو دور سے ہی اسے پورے انہماک کے ساتھ بگلے جیسے سفید بالوں والے اختر محمود کی باتیں سنتا دیکھ کر ہو رہا تھا۔

عرشی کو اختر محمود جیسے لوگوں کی قوت برداشت پر حیرت ہوتی تھی جن پر کام دھن میں نہ سردی اثر کرتی تھی نہ ہی گرمی، جو کئی سال باہر ٹھنڈے علاقوں میں گزارنے کے باوجود بھی اس عمر میں اس دھوپ کے نیچے یوں آرام سے پھر رہے تھے جیسے کوئی خوشگوار موسم میں باغ کی چہل قدمی کو نکلتا ہے۔

عرشی نے دور کھڑے حذیفہ اور اختر محمود پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے پیچھے بنے سنگل اسٹوری آفس سے متصل کمرے کا رخ کیا جس کی ایک دیوار میں سے آدھے سے زیادہ باہر نکلی چوکور یہ نما مشین کے اندر سے نکلتی گڑگڑاہٹ عرشی کو یہ تسلی دینے کے لیے کافی تھی کہ کم از کم اس کمرے کا درجہ حرارت اس کی مرضی کے مطابق ضرور ہوگا۔

اس نے اپنے برابر کھڑی بختو کو گیٹ کے پاس درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑی کی ہوئی گاڑی میں سے منرل واٹر کی بوتل لانے کا کہہ کر اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

باہر کی تیز دھوپ سے ایک دم اندر آنے پر عرشی کو کچھ دیر کمرے میں اندھیرے ہیولوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

تھوڑی دیر میں جب عرشی کی آنکھیں صاف دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ کمرا اس سینٹر کا کمپیوٹر روم تھا۔ دیوار کے ساتھ ترتیب سے رکھی ڈھیر ساری میز کرسیاں اور ہر میز پر رکھا ہوا ایک عدد کمپیوٹر۔

یہ کمپیوٹر روم باہر سے آنے والی ٹیم کے اصرار پر بنایا گیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں سکھائے جانے والے علوم کو جدید وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ غریب گھرانوں سے آئی ایسی باصلاحیت لڑکیاں جن میں کچھ نیا سیکھنے کی قابلیت موجود ہو انہیں اس کی بھی تربیت حاصل کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیے تاکہ وہ بھی تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

خود عرشی کی نظر میں یہ چونچلے ان عورتوں کی اوقات سے بڑھ کر تھے جو یہاں پر آیا کرتی تھیں۔ غریبوں کی حیثیت اور ان کے معاشرے میں مقام سے متعلق عرشی کی بڑی مخصوص اور محدود سی سوچ تھی۔

عرشی کے علاوہ اس وقت اس لمبوترے کمرے کے اندر ایک اور لڑکی بھی موجود تھی جس نے عرشی کے اندر داخل ہوتے وقت اسے سر کے خفیف اشارے سے خوش آمدید کہا تھا اور جسے آنکھوں کے سامنے چھائے اندھیرے اور دماغ پر چڑھی گرمی کے زیر اثر عرشی دیکھ نہیں پائی تھی۔

پر اب گرمی اور اندھیرا دونوں چھٹ چکے تھے۔

عرشی نے اب دلچسپی کے ساتھ اس سادہ سے پرنٹڈ لان کے سوٹ میں ملبوس اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سارے کمپیوٹروں کو باری باری آن کرکے انہیں چیک کررہی تھی۔

اس نے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا جس میں سے کچھ لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر آرہی تھیں۔

عرشی نے آج سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً" یہ بھی باہر سے آنے والی ٹیم کا ہی حصہ تھی کیونکہ اس کے انداز میں جو بے نیازی اور خود اعتمادی تھی، وہ اکثر یہاں کام کرنے والی چھوٹی موٹی سوشل ورکرز میں نہیں پائی جاتی تھی۔

عرشی کو اس لڑکی میں عجیب سے کشش محسوس ہوئی۔ انتہائی شفاف اجلا چہرہ جس سے کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہورہی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں گہری چپ اور خاموشی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ تب ہی کمرے کا چوبی دروازہ کھلا اور حذیفہ اور اختر محمود ایک

دوسرے کی معیت میں کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

"یہ ہمارے سینٹر کا ایک اور نیا اضافہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم عورتوں کو یہ سب سکھا کر انہیں اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ہم نے یہ ترغیب کبھی نہیں دی۔ ہمارا مقصد خود کفالت ہے، خود مختاری نہیں۔" اختر محمود حذیفہ کو بتاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ حذیفہ کو ابھی اس عمارت کا معائنہ کرا کے لا رہے تھے جس کے مختلف حصوں میں مکمل ہو جانے کے بعد سلائی، کڑھائی اور بنائی کی مشینیں سیٹ کی جاتی تھیں اور اب اس سے اگلا اور بہتر قدم کمپیوٹر کی تربیت تھا۔ اختر محمود صاحب کا یہ خواب اب تک جاری تھا۔

"یہ جگہ ہم نے انتہائی کم وقت میں سیٹ کی ہے اور یہ سب جویریہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم اتنے کم وقت میں بھی اس ٹارگٹ کو پورا کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔"

"جویریہ؟" اختر محمود اور حذیفہ کی طرف بڑھتی ہوئی عرشی ایک لمحے کو ٹھٹکی۔

ایک نام سا نام ہی تو تھا جو کسی کا بھی ہوسکتا تھا۔ مگر یہ وہ نام تھا جو اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی عرشی کو دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔

عرشی نے تیزی کے ساتھ پلٹ کر کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا جو شاید اٹھ کر آنے والوں کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔

مگر اپنی جگہ سے اٹھ نہیں پائی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عرشی فوراً سمجھ گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس کا صرف نام ہی نہیں بلکہ اس کا پورا وجود ہی عرشی کے لیے خطرہ ہے۔

عرشی نے لڑکی پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے وحشت زدہ ہو کر حذیفہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ اتنا ہی سفید پڑچکا تھا جتنا کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا تھا۔ ایسا لگا جیسے زمین کی گردش تھوڑی دیر کے لیے رک سی گئی ہو جیسے وقت اپنی جگہ ٹھہر گیا ہو۔

اور اس تھمے ہوئے لمحے میں صرف جویریہ اور حذیفہ ہی نہیں وہ بھی شامل ہو چکی تھی۔

اس سارے ماحول میں صرف اختر محمود ہی وہ ایک واحد شخص تھے جنہیں ابھی تک ان قیامت خیز لمحوں کی خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ اسی جوش و خروش سے حذیفہ کو سینٹر کی تفصیلات سے آگاہ کیے جارہے تھے۔ فرق صرف یہ ہوا تھا کہ حذیفہ کو اب ان کی کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اختر محمود کے علاوہ اب کسی کو بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا یہاں تک کہ عرشی کو بھی نہیں جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی بت بنے حذیفہ کی طرف دیکھتی تو کبھی پتھر کی بنی جویریہ کو۔

عرشی کا بس چلتا تو وہ جویریہ اور حذیفہ کے درمیان ایسی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی جو انہیں آر پار دیکھنے کی صلاحیت سے محروم کردیتی۔

پر اب ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ اب بہت دیر ہوچکی تھی۔

"جویریہ!" حذیفہ کی سانسوں کے ساتھ نکلنے والے نام نے اختر محمود کی چلتی زبان کو روک دیا۔

پہلی بار انہیں کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا۔ انہوں نے الجھ کر اپنے برابر کھڑے حذیفہ کی طرف دیکھا جو اب وہاں نہیں تھا۔

وہ جویریہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں جویریہ۔ اتنے سال کہاں تھیں تم؟"

وہ عرشی اور اختر محمود، دونوں میں سے کسی کی بھی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جویریہ کو جھنجوڑتے ہوئے اس سے باز پرس کر رہا تھا اور جویریہ وہیں وومن سینٹر میں کپڑے اور روئی سے بنائی جانے والی بے جان چکیلی گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں کے زور سے آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو اور جس کے ٹوٹ جانے کا ڈر اسے آنکھیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہا ہو۔

شاید یہ سب کچھ ایک خواب ہی تھا۔ جویریہ نے بند آنکھوں کے ساتھ سوچا اور اگر یہ واقعی خواب تھا تو اس خواب کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے وہ تمام عمر اپنی آنکھیں موندنے کو تیار تھی۔

"جویریہ! آنکھیں کھولو۔ دیکھو میری طرف۔" حذیفہ نے اس سے کہا۔ یہ خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ جویریہ کے کان حذیفہ کی آواز سن رہے تھے' جب حذیفہ کے ہاتھوں کی گرمی اسے اپنے بازوؤں کے اندر حیات بن کر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن اگر یہ آواز' یہ وجود حقیقت نہ ہوا تو اب کی بار وہ برداشت نہیں کر پائے گی۔

جویریہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا دھندلایا ہوا ذہن تاریکی سے روشنی میں یوں واپس آیا' جیسے کوئی غوطہ خور گہرے پانی کو پیچھے چھوڑتا ہوا سطح اور زندگی کی طرف واپس لوٹتا ہے۔

کمپیوٹر روم اور اس میں موجود لوگ ایک بار پھر منظر میں واپس آگئے۔

دروازے کے پاس کھڑی خوف زدہ چہرے والی عورت' اس کے برابر پریشان ہوتے پروفیسر صاحب اور ان دونوں سے دور اور جویریہ کے بالکل پاس ابھی تک اس کے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے کھڑا حذیفہ۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟"

حذیفہ دنیا بھر کی تھکان اپنے لہجے میں سموئے اس سے ایسے سوال پوچھ رہا تھا جن کا کوئی تسلی بخش جواب جویریہ کے پاس نہیں تھا۔

"میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے ہو۔"

ساری وضاحتیں' سارے جواب ایک دم سے مت بے معنی اور فالتو لگنے لگے تھے۔

اپنی زندگی کے آٹھ قیمتی سال اس نے ایک جھوٹ کی نذر کر دیے۔ وہ اب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ زیادہ قصور کس کا تھا۔

اس کا جس نے جھوٹ بولا یا پھر اس کا جس نے بلا سوچے سمجھے اس جھوٹ کا یقین کر لیا۔

"تم سے یہ سب کس نے کہا۔" حذیفہ نے چونک کر پوچھا۔ "اور اگر کہا بھی تھا تو تم نے اتنی آسانی سے کیسے مان لیا۔ کم از کم ایک بار مجھے پکار کر تو دیکھتیں۔"

"پکارا تھا۔ میرے دل نے کئی بار تمہیں پکارا تھا۔ تخلیق کے کرب سے گزرتے ہوئے بھی میں نے بار بار تمہارا ہی نام لیا تھا۔ پر میری آواز تم تک پہنچ ہی نہیں پائی۔" وہ حذیفہ کو روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ آنسو جو پچھلے آٹھ سال سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے' آنکھوں کو جل تھل کرنے لگے۔

"تخلیق کا کرب؟" عرشی کے ذہن میں یہ فقرا ہتھوڑے کی طرح لگ کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" حذیفہ نے جویریہ کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا خود کا رنگ اچانک ہی بے حد پیلا پڑ گیا تھا۔

"یہ تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو حذیفہ! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تمہیں ایک بار پھر سے پھنسانے کے لیے مکر و فریب کا جال بن رہی ہے۔"

عرشی کا خوف اب ٹھیک ٹھاک دہشت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جو کچھ اس کے سامنے ہو رہا تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا' اسے ہونے کی وہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"جویریہ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔ سچ کیا ہے۔" حذیفہ نے عرشی کی مداخلت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جویریہ کو ایک بار پھر سے جھنجوڑا۔

"جھوٹ بول رہی ہے یہ۔ بکواس کر رہی ہے۔ یہ کسی تخلیق کے کرب سے نہیں گزری۔ تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے ایک نئی کہانی گھڑ رہی ہے۔"

عرشی ہذیانی انداز میں چلائی۔ اسے اپنی پوری زندگی ریت کی مانند لگنے لگی تھی' جسے وہ جتنا زیادہ زور لگا کر مٹھی میں بھینچے رکھنے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس کی انگلیوں کے بیچ سے پھسلتی جا رہی تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھو۔ یہ بھی اس وقت وہیں تھی' جب میں نے تمہارے بچے کو جنم دیا تھا۔"

جویریہ نے عرشی کی سمت اشارہ کر کے کہا تو وہ حیرت کے مارے اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جویریہ کا بچ بچ دماغ چل گیا ہے۔ اس نے تو آج سے پہلے جویریہ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

عرشی اس بات کو جویریہ کے پاگل پن کی سند کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ضرور کچھ کہتی اگر اس کے عین پیچھے کوئی چیز کسی کی زوردار آواز کے ساتھ زمین پر نہ گر پڑتی۔

اس آواز پر عرشی نے تیزی کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ منرل واٹر کی بوتل تھی جس کا ڈھکن استعمال کے بعد ٹھیک سے بند نہیں کیا گیا تھا اور اب زمین پر گری ہوئی اس بوتل میں پانی بہہ کر کمپیوٹر روم کے فرش کو سیراب کر رہا تھا۔

لیکن جس کے ہاتھوں سے یہ بوتل گری تھی اس نے اسے اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ بنتو تھی' جو عرشی کے پیچھے ادھ کھلے دروازے کے بیچ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"بہشت بی بی۔" پروفیسر اختر کو بھی مسز ملک کی یہ ملازمہ خاص یاد آ گئی جو جویریہ کے حمل کے دوران سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔

"پوچھو اس عورت سے۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" جویریہ نے روتے ہوئے حذیفہ سے کہا۔

حذیفہ کی نظریں بنتو پر جم گئیں۔

"بولو۔ سچ کیا ہے؟"

حذیفہ کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ بنتو سر سے پیر تک خوف سے لرز گئی۔

بنتو رعنا کی پرانی ملازمہ تھی اور ان ذمہ داروں میں سے ایک تھی جو رعنا کی وفات کے بعد عرشی کو ورثے میں ملے تھے۔

بنتو کو اس وقت اگر ذرا سی بھی امید ہوتی کہ وہ آج اس سوال کا جواب دیے بنا یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اسی ادھ کھلے دروازے سے پلٹ کر واپس بھاگ جاتی مگر اس بات کو سمجھنے کی عقل اس جاہل اور ان پڑھ عورت میں بھی تھی کہ اب وہ کہیں بھی بھاگ کر چلی جائے' سچائی اگلے بنا بچ نہیں سکتی۔

"وہ وہ جی۔ زچگی ہوئی ضرور تھی پر بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔" بنتو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میرا بچہ زندہ اس دنیا میں آیا تھا۔" اب کی بار جویریہ نے حذیفہ کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی۔" بنتو گھبرا کر بولی۔ "بچہ مردہ تھا۔ ہم لوگوں نے اسے خود دفنایا تھا۔ آپ پروفیسر صاحب سے پوچھ لیں۔"

بنتو نے ایک کونے میں کھڑے پروفیسر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ایک نومولود دفنایا ضرور گیا تھا۔ اتنا تو پروفیسر صاحب کو بھی یاد تھا مگر جس جویریہ کو وہ جانتے تھے' وہ اتنی بڑی بات بلاوجہ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ہو رہا تھا' اسے دیکھنے کے بعد انہیں بالکل یقین نہیں رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے برسوں پہلے دیکھا۔ وہ واقعی سچ تھا یا پھر فقط ان کی نظر کا دھوکا۔ ایک ایسا دھوکا جو جان بوجھ کر دیا گیا ہو۔

"نہیں۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے خود اپنے بچے کے رونے کی آواز سنی تھی۔" جویریہ نے کہا۔

"اس کو غلطی لگی ہے جی۔ یہ تو بے ہوش تھی اس وقت۔" پروفیسر صاحب کی طرف سے کوئی تائیدی بیان نہ پا کر بنتو سخت بوکھلائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"مجھے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ایک ماں اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اس کے رونے کی آواز سنی تھی لیکن کسی نے میری بات نہیں مانی۔ سب مجھ سے یہی کہتے رہے کہ

اس کی سانسیں اس کے پیدا ہونے سے پہلے بند ہو چکی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟"

جویریہ نے حذیفہ کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار روتے ہوئے اس سے وہ سوال کیا' جس نے پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دیا تھا۔

پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اس کے تحت الشعور میں گونجنے والی ایک مہین سی آواز کی بازگشت نے نجانے کتنی اندھیری راتوں میں اسے جھٹکے سے بیدار کیا تھا۔

دن کے اجالوں میں بھی نجانے کتنی بار اس کے راہ چلتے قدم کسی بچے کے رونے کی آواز پر بری طرح لڑکھڑائے تھے۔

اور سب بضد تھے کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی؟

حذیفہ کچھ دیر روتی بلکتی جویریہ کے سامنے ساکت کھڑا رہا پھر آہستہ سے اسے خود سے الگ کر کے پیچھے کی طرف مڑا۔

اس کی نظروں میں جو کچھ تھا' اسے دیکھ کر عرشی خوف زدہ ہو کر اس کے رستے سے ہٹ گئی۔

لیکن حذیفہ کو اس وقت عرشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"اگر بچہ زندہ پیدا ہوا تھا تو پھر یقیناً" تم نے ہی اسے بعد میں مارا ہو گا۔ بولو کیسے مارا تھا؟ گلا گھونٹا تھا یا پھر زہر دیا تھا؟" حذیفہ نے بختو کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہم ... میں نے کچھ نہیں کیا تھا جی۔" بختو نے سر سے پیر تک کانپتے ہوئے کہا۔ حذیفہ کی آنکھوں میں اس قدر اشتعال تھا کہ بختو کی سٹی گم ہو رہی تھی۔

"جھوٹی ذلیل عورت' کیا کیا تھا تم نے میری اولاد کے ساتھ؟" حذیفہ ایک دم دھاڑ کر بولا تو بختو چیخ مار کر اس کے پیروں میں گر گئی۔

"میں نے اس کو نہیں مارا۔ میں نے تو ... میں نے اس کو چھوٹی بی بی کی گود میں لا کر ڈال دیا تھا۔"

کسی بستے بستے شہر پر بم گرنے کے بعد جو موت کا سناٹا چہار سو پھیلتا ہو گا ویسا ہی سکوت بختو کے ان الفاظ کے بعد سارے کمرے پر طاری ہوا۔

"معاف کر دیں صاحب! معاف کر دیں۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں جی۔ جو ملکانی جی نے بولا' ہم نے وہی کیا۔ معافی ..." بختو حذیفہ کے پیروں سے لپٹی گھگھیائے جا رہی تھی' مگر اب حذیفہ کو کچھ بھی سننے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اس انکشاف کے بعد سب ہی دم بخود کھڑے تھے۔ خاص طور پر عرشی۔

عرشی کو لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو۔

"ہنیہ ... حذیفہ کی ہی بیٹی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" عرشی نے چکراتے سر کے ساتھ سوچا۔

لیکن اگر گزرے ماہ و سال پر وہ ایمان داری کے ساتھ نظر ڈالتی تو ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں لگ رہا تھا۔

ہنیہ کو پارک میں کھلاتے وقت یا بازار میں لے کر گھومتے ہوئے جب اکثر لوگ عرشی کے بجائے حذیفہ سے اکثر کہتے تھے کہ آپ کی بیٹی بالکل آپ پر ہے تو عرشی کو عجیب نہیں لگتا تھا۔ ہنیہ ہر وقت تو حذیفہ کی گود میں یا اس کے کندھوں پر چڑھی رہتی تھی۔ ظاہر ہے جو ہر وقت اسے ساتھ لیے پھرے گا لوگ اسی سے یہ بات کہیں گے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جو مماثلت راہ چلتے اجنبیوں کو بھی دکھائی دے جاتی تھی' وہ عرشی کو کیوں نہ نظر آ سکی۔

شاید اس لیے کہ وہ اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی آنکھوں پر بندھی خود غرضی کی پٹی نے اس پر کبھی حقیقت کا ادراک ہونے ہی نہیں دیا۔

ہنیہ کے ہر رنگ' ہر روپ میں اس کا باپ جھلکتا تھا۔ اس کی ہر عادت حذیفہ کا عکس تھی۔

ہنیہ کی جن باتوں کو عرشی حذیفہ کی نقل سمجھا کرتی تھی ... وہ اس بچی کا اصل تھیں' جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھیں۔

کتنی انہونی بات تھی کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود عرشی ہنیہ کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کر سکی جبکہ حذیفہ نے اسے اسی لمحے اپنا لیا تھا' جب پہلی بار گود میں اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

شاید یہ خون کی مہک تھی' جس نے باپ بیٹی کو ایک کر دیا اور عرشی اتنے سال ان کے ساتھ رہنے کے باوجود کبھی ان کا حصہ نہ بن سکی۔

"تم ..." حذیفہ پیروں میں گری پڑی بختو کو نظر انداز کر کے عرشی کی طرف مڑا۔ "تم اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہو' یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" حذیفہ عرشی کو دیکھتے ہوئے تنفر سے بولا تو وہ دنگ رہ گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عرشی نے شدید حیرت کے عالم میں حذیفہ سے پوچھا۔ جواب میں حذیفہ عرشی کو بازو سے گھسیٹ کر جویریہ کے سامنے لے آیا۔

"دیکھو اس کی طرف ... اور کیا کیا کچھ چھینو گی تم اس لڑکی سے ... اس کی زندگی کی خوشیاں لے کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی جو تم نے اس کی اولاد بھی ہتھیا لی۔ ایک ماں کی گود کو ویران کرتے ہوئے تمہارے دل کو کچھ نہیں ہوا؟"

حذیفہ آنکھوں میں نفرت لیے عرشی سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ سب میں نے نہیں کیا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ ممی نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہنیہ کو کہاں سے لے کر آئی تھیں۔"

"تم مجھ سے یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تمہاری "ممی" تمہاری مرضی کے خلاف بھی کوئی کام کر سکتی تھیں۔"

حذیفہ کے لہجے میں اس کی نگاہوں سے بھی زیادہ تنفر تھا۔

"بس کرو عرشی! اور کتنے جھوٹ بولو گی مجھ سے ... اور کتنے دھوکے دو گی۔"

حذیفہ کے انداز میں عرشی کے لیے ذرا بھی رعایت نہیں تھی۔ رعنا نے ہمیشہ پیسے کے بل پر سب کچھ خریدا تھا یہاں تک کہ انسانوں کو بھی۔ کلینک کی ڈاکٹر سے لے کر وومن سینٹر کی ہیلتھ ورکر تک اور اس کے علاوہ بھی جانے کتنے لوگ' جن کے بارے میں عرشی کو واقعی خبر نہیں تھی۔

لیکن ایک بات کا عرشی کو اچھی طرح سے پتا تھا اور وہ یہ کہ رعنا نے جو کچھ بھی کیا' صرف اس کی خاطر کیا۔ شاید رعنا بذات خود اتنی سنگدل نہ تھیں' جتنی عرشی کی محبت میں بے بس ہو کر مجبور ہو گئی تھیں۔

رعنا نے حذیفہ کی ہی بیٹی کو عرشی کی گود میں ڈال کر ہمیشہ کی طرح بہت خطرناک داؤ کھیلا تھا مگر اس کھیل میں رعنا اکیلی نہ تھیں۔ کچھ ہاتھ اس میں تقدیر کا بھی تھا ورنہ عرشی کی گود اسی رات سونی نہ ہوتی' جس رات قدرت نے جویریہ کی گود بھری تھی۔

اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ اگر عرشی کو ایک جیتے جاگتے بچے کی ضرورت نہ ہوتی تو کیا تب بھی رعنا کو بچہ تبدیل کرنے کا خیال آتا؟

اگر نہیں تو پھر ہنیہ کا کیا بنتا؟

کیا اسے اس کی ماں کے پاس رہنے دیا جاتا یا پھر رعنا اسے حذیفہ پر حق جتانے کا ذریعہ سمجھ کر جویریہ سے علیحدہ کر دیتیں؟

یہ سارے وہ سوال تھے جن کے جواب رعنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔

رعنا تو اپنے اعمال قبر میں لے کر چلی گئیں اور ان کا نتیجہ بھگتنے کے لیے عرشی کو اکیلا چھوڑ گئیں۔

بختو اب تک فرش پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور پروفیسر صاحب چپ چاپ ایک کونے میں کھڑے ہو کر وہاں دیکھ رہے تھے' جہاں حذیفہ نے اپنے بازو کے حلقے میں روتی ہوئی جویریہ کو سمیٹ رکھا تھا۔

آخر پروفیسر صاحب تھک کر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ان کی کیفیت اس وقت ایک ایسے میر کارواں کی سی تھی' جو اپنی سنگت میں سفر کرنے والے لوگوں کو بخیر و عافیت منزل تک پہنچا دینے کے بعد آسودگی بھری تھکن کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پھر یاد آیا کہ وہ آج کا سگریٹ پی چکے

ہیں۔ کون پورا ہو چکا تھا۔ ان کے سگریٹ کا بھی اور اس لڑکی کی آزمائش کا بھی جو برسوں سے نارسائی کی آگ میں جل رہی تھی۔

انہوں نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے ڈبیہ واپس جیب میں ڈال لی۔

”حذیفہ پلیز۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔“ عرشی نے حذیفہ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کا سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

حذیفہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو عرشی کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ وہ حذیفہ جسے عرشی کی خوشبو میں بسی شہد رنگت زیشمی زلفیں مائل نہ کر سکیں اب جویریہ کے الجھے سلجھے بالوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھیں موندے سکون سے کھڑا تھا۔

اس لمحے عرشی کو حذیفہ کے چہرے پر الفت و محبت کے وہ تمام رنگ دکھائی دے رہے تھے جو اس کا اتنے برسوں کا ساتھ بھی کبھی لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

عرشی کو ایک دم احساس ہوا کہ اتنے سال تک اپنی جس فتح کے نشے میں وہ چور رہی وہ کس قدر کھوکھلی تھی۔ اس نے حذیفہ کو کبھی جیتا ہی نہیں تھا فقط اس کا خول اپنایا تھا۔ اصل حذیفہ تو کہیں جویریہ کے پاس ہی رہ گیا تھا۔

وہ تو عرشی کا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

کسی کو زبردستی بھی حاصل کیا جا سکتا ہے بھلا؟ اس سارے قصے میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ حذیفہ کو آج یہاں آنے کے لیے عرشی نے ہی مجبور کیا تھا۔

ورنہ آتا تو کیا ہوتا؟

یہ ایک بے ضرر سا معمول کا وزٹ ہوتا جس کے ختم ہونے کے بعد عرشی اپنی زندگی کے روز مرہ معمولات کی طرف واپس لوٹ جاتی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ آٹھ سال کی جو مہلت قدرت کی طرف سے عرشی کو ملی تھی اس کی معیاد پوری ہو چکی تھی۔

حذیفہ کو ہر حال میں آج ساتھ آنا ہی تھا اور جویریہ کو بھی یہیں پر موجود ہونا تھا۔ کیونکہ قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔

عرشی اب اس فیصلے کی بازگشت کو سن رہی تھی جو اتنے سالوں کے بعد لوٹ کر حساب برابر کرنے آئی تھی اور عرشی کو ڈر تھا کہ اگر حساب انصاف کے ساتھ کیا گیا تو اس کے ہاتھ خسارے کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

آٹھ سال میں پہلی بار عرشی کی آنکھوں سے سچ کے آنسو بہنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

پھر اس نے مجھ سے کچھ نہیں لیا۔ نہ بنگلہ نہ گاڑی بس فقط اپنی ذات کو میری زندگی سے نکال کر لے گیا۔

دوسرے لفظوں میں مجھے تہی داماں کر گیا۔

ہاں یہ میں ہوں۔ عرشین حذیفہ۔

میں جانتی ہوں کہ اس کے نام کو بھی اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا حق اب مجھے نہیں رہا ہے۔ حذیفہ کے جانے کے کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے اس کی طرف سے طلاق کے کاغذات موصول ہو گئے تھے۔

مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔

جاتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے جتنا غصہ اور جتنی نفرت تھی اس کو دیکھ لینے کے بعد میرا کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا رہنا حماقت ہوتی۔

میرے ہر جھوٹ، ہر غلط بیانی کو اتنے سال خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والا میری زندگی کے اس سب سے بڑے سچ کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوا کہ اس کی بیٹی کو اپنی ماں سے جدا کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

دل میں اگر کسک اٹھتی ہے تو اس بات کی کہ جویریہ کے ساتھ جڑے، جس رشتے کو دوری کے آٹھ طویل سال بھی ختم نہ کر سکے، میرے ساتھ اسی تعلق کو

توڑنے میں حذیفہ نے آٹھ ماہ بھی نہ لگائے۔

ممی کہا کرتی تھیں کہ سات سال کم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کو۔ اور اگر میں واقعی کوشش کرتی تو شاید میں بھی حذیفہ کے دل میں اپنا مقام بنا سکتی تھی پھر شاید وہ مجھ سے اتنی بے دردی کے ساتھ ناتا توڑنے سے پہلے ایک بار رک کر سوچتا ضرور۔ اگر وہ مجھ سے اس قدر بدظن نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اب بھی اپنی زندگی میں میرے لیے تھوڑی سی گنجائش نکال لیتا۔

اسے رشتوں کا مان رکھنا آتا تھا۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ جتنا عرصہ میرے ساتھ رہا میں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اب وہ نہیں ہے تو احساس ہوا کہ میں اس کے بنا کچھ بھی نہیں۔

جب وہ تھا تو مجھے اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ نہیں ہے تو میں سرِشام گھر لوٹ آتی ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھی اس کی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر اس کے ہونے کے احساس کو اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے ایک ہی جھٹکے میں جویریہ اور میری زندگیوں کو الٹ پلٹ کر ڈالا ہو۔ کل تک جو میرے پاس تھا، وہ سب اس کا ہو چکا ہے اور جو کچھ میں نے اس سے چھینا تھا، وہی میرا مقدر ٹھہرا۔

نارسائی کے اس کرب سے مجھے بھی آشنائی ہو گئی جس کا عذاب وہ لڑکی اتنے سال تک سہتی رہی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جویریہ کی سزا تو آٹھ سال کے بعد اختتام پذیر ہو گئی لیکن کیا میری اس قید تنہائی کا بھی کوئی انت ہو گا؟

کچھ دن پہلے مجھے ان دونوں کے ہاں جڑواں بیٹوں کے پیدا ہونے کی خبر ملی تھی۔ میں خوش ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں وہ بھی خوش ہو گا۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں۔

ہنیہ کو بھی ان دونوں نے بورڈنگ اسکول کے بجائے ریگولر اسکول میں داخل کروا دیا ہے تاکہ وہ بھی عام بچوں کی طرح زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ماں باپ کے ساتھ گزار سکے۔ اسکول کے خشک ماحول کی جگہ اب اسے ماں باپ کا پیار ملے گا جو اس کا حق اور ضرورت ہے۔

باپ کی توجہ اور پیار تو ہنیہ کو شروع دن سے ہی حاصل تھی البتہ ہنیہ کے دل کی سلیٹ کا ماں والا حصہ تو کورا ہی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جویریہ بہت پیار سے اس پر اپنا نام کندہ کرے گی۔

میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا، کسی سے ملنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں جاتی ہوں۔ کام بھی کرتی ہوں۔ ممی کی این جی او کی ساری ذمہ داری اب میرے کندھوں پر ہے۔

سب لوگ کہتے ہیں کہ مسز عطا کی بیٹی ان ہی کی طرح خدا ترس اور بے غرض ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے والی۔

مگر سب غلط کہتے ہیں۔

میں بے غرض نہیں ہوں۔

دکھی انسانیت کی خدمت میں بھی میری اپنی غرض شامل ہے۔

حذیفہ نے ایک بار کہا تھا کہ عرشی! تم دوسروں کا بھلا کرو گی تو خدا تمہارا بھلا کرے گا۔

مجھے خدا سے کس بھلے کی امید ہے، یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم، پھر بھی میں اس آس پر لوگوں کا بھلا کیے جا رہی ہوں کہ کبھی تو خداوند کریم کو میری حالت پر رحم آئے گا۔

کبھی تو میرے دل کی بے چینی اور کسک ختم ہو گی۔

کبھی تو وہ مجھے بخش کر میرے گناہوں کا بوجھ میرے ضمیر سے ہٹائے گا۔

کبھی تو۔